عقائد اسلام

[illegible] کتاب

[illegible]

[illegible]

حضرت مولانا سید سلیمان ندوی نور اللہ مرقدہ

ادارہ اسلامیات لاہور



عقائدِ اسلام

جس میں اسلام کے جملہ اصولی عقائد کو سہل زبان میں پیش کیا گیا ہے

تالیف

حضرت مولانا محمد طاہر صاحب قاسمی رحمہ اللہ تعالیٰ

پیش لفظ

حضرت مولانا سید سلیمان ندوی نور اللہ مرقدہٗ

ادارہ اسلامیات لاہور



پہلی بار عکسی طباعت : ۱۹۸۱ء

باہتمام : اشرف برادران سلمہم الرحمٰن

کتابت : خلیب عبدالحلیم ساجد

طباعت : وفاق پریس لاہور

قیمت :

ناشر

ادارۂ اسلامیات ۱۹۰۔ انارکلی لاہور

ملنے کے پتے

- دارالاشاعت بندر روڈ۔ کراچی
- ادارۃ المعارف دارالعلوم کراچی ۱۴
- مکتبہ دارالعلوم۔ دارالعلوم کراچی ۱۴

پیش لفظ

ہمدست کتاب "عقائد الاسلام قاسمی" مفکر ملت حضرت مولانا محمد طاہر صاحب قاسمی رحمۃ اللہ علیہ حجۃ اللہ فی الارض شیخ الاسلام حضرت مولانا قاسم صاحب نانوتوی قدس سرہ برادر خورد حضرت حکیم الاسلام مدظلہ کی ایک کامیاب ترین تصنیف، اور مسلمانوں کے ہر طبقہ کے فکر و ذہن کی رعایت کے ساتھ اسلامی عقائد کی اشاعت کے بارے میں ایک انوکھا اور کامیاب تجربہ تھا۔

یہ کتاب حضرت مصنفؒ کی آخری تصنیف ہے اور اس کا پہلا ایڈیشن ۵ اکتوبر ۱۹۵۲ء کی صبح کو اس وقت پہنچا کہ جب حضرت مصنف سفرِ آخرت فرما چکے تھے اور تجہیز و تکفین کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ حضرت مولانا محمد طاہر صاحب رحمۃ اللہ علیہ اپنے علم و بصیرت میں قاسمی روایات کے حامل تھے۔ اس ذوقِ بصیرت پر بطور شاہد عدل آپ کی متعدد نادر تصانیف ہیں۔ موضوعات کی ندرت مصنف کی جدت طرازِ طبیعت اور وسعت مطالعہ کی نشاندہی کرتی ہے۔ آپ کی تصانیف میں "عقائد الاسلام قاسمی" "حقیقت سحر" "النحر فی الاسلام" "التعوذ فی الاسلام" "تفسیر تقریر القرآن" "تجلیات کعبہ" کامیاب تصانیف شمار کی جاتی ہیں۔ موصوف اپنی ذاتی ذکاوت اور ذہانت کے لحاظ سے معاصرین میں غیر معمولی امتیاز کے مالک تھے۔ اکابر و اسلاف کرام سے ربط عقیدت جذب اندروں کی کیفیت اختیار کیے ہوئے تھی۔ اسلاف کی عظمتوں پر ناواجب حرف گیری مولانا مرحوم کے لیے ناقابل تحمل تھی۔ زبان و قلم سے اس کا دفاع کرتے

ہیں کبھی مداہنت نہیں برتی۔ صاف گوئی اور صاف طبعی آپ کا امتیازی جوہر تھا دارالعلوم دیوبند اور اس کی تاریخ سے موصوف کی قلبی وابستگی بذاتِ خود ایک تاریخی چیز تھی۔ مختلف حیثیات سے دارالعلوم دیوبند کی زندگی بھر خدمت انجام دیتے رہے۔

قاسمی رنگ وروایات کی برقراری کے لیے حضرت موصوف کی مسلسل جد وجہد ایک دور میں ان کے حق میں ان کا سب سے بڑا جرم بن گئی۔ جس کی پاداش میں مسلسل چودہ سال آپ کو اس علمی وطن سے جلاوطن ہونا پڑا۔ آخیر لمحات حیات میں اس جذبہ صادق نے پھر یاوری کی اور دارالعلوم سے باضابطہ وابستگی میسر آگئی جو آخرت تک قائم رہی بالآخر ۵ر اکتوبر ۱۹۵۲ء (۱۴ر محرم ۱۳۷۲ھ) خانوادۂ قاسمی کو آپ نے داغِ مفارقت دے کر داعیِ اجل کو لبیک کہا۔ انا للّٰہ وانا الیہ راجعون

خصوصی اور عمومی افادیت کے اعتبار سے "عقائدُ الاسلام قاسمی" اسلامی معاشرہ کی ایک بڑی اور اہم ضرورت کو بہتر انداز میں پورا کرتی ہے اور اسی کے ساتھ یہ حضرتِ موصوف کی آخری یادگار بھی ہے۔

ادارہ بصد خلوص اس علمی اور دینی ذخیرے کو نذرِ قارئین کر کے حضرتِ موصوف مصنف کے حق میں دعائے مغفرت اور ترقی درجات کی قارئین سے بصد خلوص استدعا کرتا ہے۔

محمد سالم القاسمی ناظم ادارہ

تاج المعارف دیوبند یوم الخمیس ۲۹ر شوال ۱۳۸۱ھ

مطابق ۵ر اپریل ۱۹۶۲ء۔

فہرست مضامین

اسلام میں عقائد کی حقیقت و اہمیت

از حضرت علامہ سید سلیمان صاحب ندویؒ

اسلام میں جس حقیقت کو عقائد کے لفظ سے تعبیر کیا جاتا ہے وہ درحقیقت چند ذہنی اُصول و مبادی ہیں جو جماعت کا کریڈ (CREED) اور تمام انسانی افکار و خیالات کی بنیاد و اساس ہیں۔ انسان کے تمام افعال، اعمال اور حرکات اسی محور کے گرد چکر کھاتے ہیں۔ یہی وہ نقطہ ہے جس سے انسانی عمل کا ہر خط نکلتا ہے اور اس کے دائرہ حیات کا ہر خط اسی پر جاکر ختم ہوتا ہے کیونکہ ہمارے تمام افعال اور حرکات ہمارے ارادے کے تابع ہیں ہمارے ارادہ کا محرک، ہمارے خیالات اور جذبات ہیں اور ہمارے خیالات اور جذبات پر ہمارے اندرونی عقائد حکومت کرتے ہیں عام بول چال میں انہی چیزوں کی تعبیر ہم "دل" کے لفظ سے کرتے ہیں۔ اسلام کے معلمؐ نے بتایا کہ انسان کے تمام اعضاء میں اس کا دل ہی نیکی اور بدی کا گھر ہے۔ فرمایا:

الا ان فی الجسد مضغۃ اذا صلحت صلح الجسد کلہ و اذا فسدت فسد الجسد کلہ الا وھی القلب (صحیح بخاری کتاب الایمان)	انسان کے بدن میں گوشت کا ایک ٹکڑا ہے جو اگر درست ہے تو تمام بدن درست ہے اور اگر وہ بگڑ گیا تو تمام بدن بگڑ گیا۔ ہاں وہ ٹکڑا دل ہے۔

قرآن پاک نے دل (قلب) کی تین حالتیں بیان کی ہیں سب سے پہلے قلبِ

اثیم[1] (گنہگار دل)، یہ وہ ہے جو ہمیشہ گناہوں کی راہ اختیار کرتا ہے اور تیسرا قلبِ منیب (رجوع ہونے والا دل)، یہ وہ ہے جو اگر کبھی بھٹکتا اور بے راہ بھی ہوتا ہے تو فوراً نیکی اور حق کی طرف رجوع ہوتا ہے۔

غرض یہ سب نیرنگیاں اسی ایک بے رنگ ہستی کی ہیں جس کا نام دل ہے ہمارے تمام اعمال کا محرک ہمارے اسی دل کا ارادہ اور نیت ہے اسی بھاپ کی طاقت سے اس مشین کا ہر پرزہ چلتا اور حرکت کرتا ہے اسی لیے آپؐ نے فرمایا۔ انما الاعمال بالنیات (صحیح بخاری اغاز کتاب) (تمام کاموں کا مدار نیت پر ہے۔

اسی مطلب کو دوسرے الفاظ میں آپؐ نے یوں ادا فرمایا:۔

انما لامرئ ما نوی فمن کانت هجرته الی دنیا یصیبها او الی امرأة ینکحها فهجرته الی ما هاجر الیه (صحیح بخاری اغاز کتاب)

ہر شخص کے کام کا ثمرہ وہی ہے جس کی وہ نیت کرے تو جس کی ہجرت کی غرض دنیا کا حصول یا کسی عورت سے نکاح کرنا ہو اس کی ہجرت اسی کے لیے ہے جس کے لیے اس نے ہجرت کی (یعنی اس سے اس کو ثواب حاصل نہ ہوگا۔

آج کل علمِ نفسیات نے بھی اس مسئلہ کو بداہتہً ثابت کر دیا ہے کہ انسان کی عملی

---

[1]: قرآنِ پاک کی آیت میں یہ ہے فانه اثم قلبه۔

اصلاح کے لیے اس کی قلبی اور دماغی اصلاح مقدم ہے اور انسان کے دل اور ارادہ پر اگر کوئی چیز حکمراں ہے تو وہ اس کا عقیدہ ہے صحیح اور صالح عمل کے لیے ضروری یہ ہے کہ چند صحیح اصول و مقدمات کا ہم اس طرح تصور کریں کہ وہ دل کا غیر مشکوک یقین اور غیر متزلزل عقیدہ بن جائیں اور اسی صحیح یقین اور مستحکم عقیدہ کے تحت ہم اپنے تمام کام سرانجام دیں۔ جس طرح اقلیدس کی کوئی شکل چند اصول موضوعہ اور اصول متعارفہ کے ماننے بغیر نہ بن سکتی ہے نہ ثابت ہو سکتی ہے۔ اسی طرح انسان کا کوئی عمل صحیح اور درست نہیں ہو سکتا جب تک کہ اس کے لیے بھی چند مبادی اور چند اصول موضوعہ ہم پہلے تسلیم نہ کر لیں جن کو ہم عقیدہ کہتے ہیں۔ ہمیں بظاہر عقل ہمارے ہر کام کے لیے رہنما نظر آتی ہے۔ لیکن غور سے دیکھیے کہ ہماری عقل بھی آزاد نہیں وہ ہمارے دلی یقین رجحانات اور اندرونی جذبات کی زنجیر میں جکڑی ہوئی ہے اسی لیے اس پا بہ زنجیر عقل کے ذریعہ ہم اپنے دلی خیالات، ذہنی رجحانات اور اندرونی جذبات پر قابو نہیں پا سکتے اگر پا سکتے ہیں تو اپنے صحیح، دلی یقینیات اور چند مضبوط دماغی و ذہنی تصورات کے ذریعہ، یہی وجہ ہے کہ قرآن پاک نے "ایمان" کا ذکر ہمیشہ عمل صالح کے ذکر سے پہلے لازمی طور سے کیا ہے اور ایمان کے بغیر کسی عمل کو قبول کے قابل نہیں سمجھا کہ ایمان کے عدم سے دل کے ارادہ اور خصوصاً اس مخلصانہ ارادہ کا بھی عدم ہو جاتا ہے جس پر حسنِ عمل کا دارو مدار ہے۔

عبداللہ بن جدعان ایک قریشی تھا جس نے جاہلیت میں بہت سے نیک کام کیے تھے لیکن بایں ہمہ مشرک تھا اس کی نسبت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے

حضرت عائشہؓ نے ایک دفعہ دریافت کیا کہ "یارسول اللہ! عبداللہ بن جدعان نے جاہلیت میں جو نیکی کے کام کیے۔ کیا ان کا ثواب ان کو ملے گا؟ فرمایا نہیں اے عائشہؓ کیونکہ کسی دن اس نے یہ نہیں کہا کہ بار آلہٰا، میرے گناہوں کو قیامت میں بخش دے۔[1]

بدر کی لڑائی کے موقعہ پر ایک مشرک نے جس کی بہادری کی دھوم تھی حاضر ہو کر کہا "اے محمدؐ میں بھی تمہاری طرف سے لڑنے کے لیے چلنا چاہتا ہوں کہ مجھے بھی غنیمت کا کچھ مال ہاتھ آئے" فرمایا "کیا تم اللہ عزوجل اور اس کے رسول پر ایمان رکھتے ہو؟ اس نے جواب دیا نہیں، فرمایا واپس جاؤ کہ میں اہل شرک سے مدد کا خواستگار نہیں، دوسری مرتبہ وہ پھر آیا اور وہی پہلی درخواست پیش کی مسلمانوں کو اس کی شجاعت و بہادری کی وجہ سے اس کی اس درخواست سے بڑی خوشی ہوئی اور دل سے چاہتے تھے کہ وہ ان کی فوج میں شریک ہو جائے لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے پھر وہی سوال کیا کہ تم کو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول پر ایمان ہے؟ اس نے پھر نفی میں جواب دیا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے پھر وہی فرمایا کہ "میں کسی مشرک سے مدد نہیں لوں گا۔ غالباً مسلمانوں کی تعداد کی کمی اور اس کی بہادری کے باوجود اس سے آپ کی بے نیازی کی اس کیفیت نے اس کے دل پر اثر کیا تیسری دفعہ جب اس نے اپنی درخواست پیش کی اور آپ نے فرمایا کہ تم کو خدا اور رسول پر ایمان ہے؟ تو اس نے اثبات میں جواب دیا تو اسلامی فوج میں ایک مجاہد کی

---

[1] ابن ابی شیبہ۔ غزوات نسخہ قلمی دار المصنفین و ابن حنبل جلد ۶ ص ۱۴۹ مصر

حیثیت اس کو داخل ہونے کی اجازت ملی۔[1] اس سے یہ ظاہر ہوا کہ جماعت میں داخل ہونے کے لیے اس کے کریڈ اور عقیدہ کو تسلیم کرنا اس جماعت کی مضبوطی کی سب سے پہلی شناخت ہے۔

غرض اسلام کے نقطہ نگاہ سے بھی ایمان ہی ہمارے تمام اعمال کی اساس ہے جس کے بغیر ہر عمل بے بنیاد ہے وہ ہماری سیرابی کا اصلی سرچشمہ ہے جس کے فقدان سے ہمارے کاموں میں حقیقت سراب سے زیادہ نہیں رہتی کیونکہ وہ دیکھنے میں تو کام معلوم ہوتے ہیں مگر روحانی اثر فائدہ سے خالی اور بے نتیجہ ہوتے ہیں خدا کے وجود کا انکار اور اس کی رضامندی کا حصول ہمارے اعمال کی غرض و غایت ہے۔ یہ نہ ہو ہمارے تمام اعمال بے نظام اور بے مقصد ہو کر رہ جائیں وہ ہمارے دل کا نور ہے وہ نہ ہو تو پوری زندگی تیرہ و تاریک نظر آئے اور ہمارے تمام کاموں کی بنیاد ریا، نمائش، جاہ پسندی، خود غرضی اور شہرت طلبی وغیرہ کے دلی جذبات اور پست محرکات کے سوا کچھ اور نہ رہ جائے۔

ایمان کے اجزاء

اسلام نے چونکہ علم و عمل، تصور اور فعل عقلیت اور عملیت میں لزوم ثابت کیا ہے اور عقائد کی راہ سے بھی اصل زور انسان کی عملیت پر صرف کیا ہے اس لیے اس نے عقائد کے اتنے ہی حصہ کا یقین و اقرار ضروری قرار دیا ہے جو عمل کی بنیاد اور اخلاق و عبادات کی اساس قرار پا سکے اور دل کی اصلاح و تزکیہ میں کام آسکے اور اسی لیے اس نے

---

[1] صحیح مسلم باب غزوات جلد دوم صفحہ ۱۰۶ مصر

عقائد کی فلسفیانہ الجھنیں اور تصورات و نظریات کی تشریح و تفصیل کر کے عملیت کو برباد نہیں کیا۔ چند سیدھے سادھے اصول ہیں جو تمام ذہنی سچائیوں اور واقعی حقیقتوں کا جوہر اور خلاصہ ہیں اور ان ہی یقین کرنے کا نام ایمان ہے نہایت صریح الفاظ میں اس ایمان کے صرف پانچ اصول تلقین کیے، خدا پر ایمان، خدا کے فرشتوں پر ایمان، خدا کے رسولوں پر ایمان، خدا کی کتابوں پر ایمان اور اعمال کی جزا اور سزا کے دن پر ایمان۔

اجزائے ایمانی کی حکمت

اللہ تعالیٰ پر ایمان کہ وہ اس دنیا کا تنہا خالق و مالک ہے اور ہر ظاہر و باطن سے آگاہ ہے تاکہ وہی ہمارے تمام کاموں کا قبلہ مقصود قرار پاسکے اور اس کی رضاجوئی اور اس کی مرضی کی تعمیل ہمارے اعمال کی تنہا غرض و غایت ہو اور ہم جلوت کے سوا خلوت میں بھی گناہوں اور برائیوں سے بچ سکیں اور ہر نیکی کو اس لیے کریں اور ہر برائی سے اس لیے بچیں کہ یہی ہمارے خالق کا حکم اور یہی اس کی مرضی ہے۔ اسی طرح اعمال ناپاک اغراض و ناجائز خواہشوں سے مبرا ہو کر خالص ہو سکیں اور جس طرح ہمارے جسمانی اعضاء گناہوں سے پاک ہوں ہمارا دل بھی ناپاک خیالات اور ہوا و ہوس کی آمیزش سے پاک ہو اور اس کے احکام اور اس کے پیغام کی سچائی پر دل سے ایسا یقین ہو کہ ہمارے ناپاک جذبات، ہمارے غلط استدلالات ہماری گمراہ خواہشات بھی اس یقین میں شک اور تذبذب نہ پیدا کر سکیں۔ خدا کے رسولوں پر بھی ایمان لانا ضروری ہے کہ خدا کے ان احکام اور ہدایات اور اس کی مرضی کا علم ان ہی کے واسطہ سے انسانوں تک پہنچا اگر ان کی

صداقت سچائی اور راست بازی کو کوئی تسلیم نہ کریں تو پیغام ربانی اور احکام الٰہی کی صداقت اور سچائی بھی مشکوک و مشتبہ ہو جائے اور انسانوں کے سامنے نیکی، نزاہت اور معصومیت کا کوئی نمونہ موجود نہ رہے جو انسانوں کے قوائے عمل کی تحریک کا باعث بن سکے پھر اچھے اور برے صحیح اور غلط کاموں کے درمیان ہماری عقل کے سوا جو ہمارے جذبات کی محکوم ہے کوئی اور چیز ہمارے سامنے ہماری رہنمائی کے لیے نہیں ہو گی۔ خدا کے فرشتوں پر بھی ایمان لانا واجب ہے کہ وہ خدا اور اس کے رسولوں کے درمیان قاصد اور سفیر ہیں مادیت اور روحانیت کے مابین واسطہ ہیں مخلوقات کو قانون الٰہی کے مطابق چلاتے ہیں اور ہمارے اعمال و افعال کے ایک ایک حرف کو ہر دم اور ہر لحظہ "ریکارڈ" کرتے جاتے ہیں۔ تاکہ ہمیں ان کی جزا دیا سزا مل سکے۔ خدا کے احکام و ہدایت جو رسولوں کے ذریعہ انسانوں کو پہنچائے گئے ہیں ان کو دور دراز ملکوں اور آئندہ نسلوں تک پہنچانے کے لیے ضروری ہوا کہ وہ تحریری شکلوں میں یعنی کتابوں اور صحیفوں میں یا لفظ آواز سے مرکب ہو کر ہمارے سینوں میں محفوظ رہیں اس لیے خدا کی کتابوں اور صحیفوں کی صداقت پر اور جو کچھ ان میں ہے اس کی سچائی پر ایمان لانا ضروری ہے ورنہ رسولوں کے بعد خدا کے احکام اور ہدایتوں کے جاننے کا ذریعہ مسدود ہو جائے اور ہمارے لیے نیکی اور بدی کی تمیز کا کوئی ایسا معیار باقی نہ رہے جس پر تمام ادنیٰ و اعلیٰ جاہل اور عالم، بادشاہ اور رعایا سب متفق ہو سکیں۔ اعمال کی باز پرس اور جواب دہی کا یقین اور اس کے مطابق جزا اور سزا کا خیال نہ ہو تو دنیاوی قوانین کے باوجود دنیا کے انسانیت کے سراپا درندگی اور بہیمیت بن جائے۔ یہی وہ عقیدہ ہے جو انسانوں کی جلوت و خلوت میں ان کی ذمہ داری محسوس کراتا ہے اسی لیے روزہ

جزا اور یوم آخرت پر ایمان رکھے بغیر انسانیت کی اصلاح و فلاح ناممکن ہے اور اسی لیے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم نے اس پر بے حد زور دیا ہے بلکہ مکی وحی کا بیشتر حصہ اسی کی تلقین اور تبلیغ پر مشتمل ہے۔ یہی پانچ باتیں اسلام کے ایمانیات کے اصلی عناصر ہیں یعنی اللہ تعالیٰ پر اس کے تمام رسولوں پر، اس کی کتابوں پر، اس کے فرشتوں پر اور روزِ جزا پر ایمان لانا یہ عقائدِ خمسہ یکجا طور پر سورہ بقر میں متعدد دفعہ کہیں مجمل اور کہیں مفصل بیان ہوئے ہیں۔

ایمان وعمل کا تلازُم

سچا ایمان اور حسن عمل درحقیقت لازم وملزوم ہیں۔ اگر کوئی کہے کہ ایک مومن بدکار ہوسکتا ہے یا نہیں؟ تو یہ سوال حقیقت میں خود تضاد کو مستلزم ہے اس لیے احادیث میں آتا ہے کہ کوئی شخص مومن ہوکر بدکاری اور چوری نہیں کرسکتا اگر کرتا ہے تو اس وقت اس کا ایمان مسلوب ہوجاتا ہے اور یہ بالکل واضح ہے کہ جب کوئی مومن برائی کرنا چاہتا ہے تو اس کے ایمان یعنی اصُول اور جذباتِ فاسِدہ کے درمیان کش مکش ہوتی ہے تھوڑی دیر یہ جنگ قائم رہتی ہے اگر ایمان اور اصُول نے فتح پائی تو وہ اپنے کو بچا لیتا ہے اور اگر جذبات غالب آتے ہیں تو ایمان اور اصول کا تخیل اس وقت دب کر اس کی نظر سے اوجھل ہوجاتا ہے اس بنا پر سچا مومن اور بدکردار ہو یہ ممکن ہی نہیں اگر ہے تو حقیقت میں ایمان کامل ہی نہیں۔ یہاں بحث رسمی ایمان و مومن سے نہیں بلکہ اس ایمان سے ہے جس کے معنی غیر متزلزل یقین اور ناقابل شک اعتقاد کے ہیں۔ جہاں کہیں رسمی وظاہری ایمان کے ساتھ برائی اور بدکاری کا وجود ہے وہ درحقیقت ایمان کا نقص اور یقین کی کمی کے باعث ہے عمل صالح کی بھی

ایمان ہی کی کمی کا نتیجہ ہے۔

ایمان کے بغیر کوئی عمل درست نہیں

لیکن بہرحال عقلی فرض اور رسمی ایمان کے لِحاظ سے یہ سوال ہوسکتا ہے اور یہ تسلیم کیا جاسکتا ہے کہ ایک بدکردار مومن اور ایک نیک اخلاص کافر ومشرک میں اگر پہلا نجات کا مستحق ہے اور دوسرا نہیں ہے تو ایسا کیوں؟ اس کا جواب شرعی اور عقلی دونوں حیثیتوں سے بالکل صاف ہے اسلام نے نجات کا مَدار ایمان اور عمل دونوں پر رکھا ہے جیسا کہ قرآنِ کریم میں ارشاد ہے۔

ان الانسان لفی خسر الا	بے شک کل انسان گھاٹے میں ہیں
الذین آمنوا وعملوا	مگر وہ جو ایمان رکھتے ہیں اور اچھے
الصلحت (عصر)	کام کر رہے ہیں

اس لیے کامل نجات کا مستحق وہی ہے جو مومن بھی ہے اور نیک کردار بھی ہے لیکن اگر ایسا نہ ہو تو خدا کفر وشرک کے گناہ کے سِوا اپنے بندہ کا ہر گناہ چاہے تو معاف کرسکتا ہے۔ البتہ شرک وکفر کو معاف نہ فرمائے گا اور اس کی سزا ضرور دیگا۔

اَلغرض ایمان کے بغیر عمل کی بنیاد کسی بلند اور صحیح تخیل پر قائم نہیں ہوسکتی اسی لیے ریا، نمائش اور خودغرضی کے کاموں میں کوئی وقعت نہیں ہوتی وہ کام جو گو بظاہر نیک ہوں لیکن کرنے والے کا ان سے اصل مقصود نام ونمود اور شہرت حاصل کرنا ہوتا ہے۔ اخلاقی نقطۂ نظر سے تمام دنیا کی کوئی قدر وقیمت نہیں ہوتی اور دنیا ان کو بے وقعت اور ہیچ سمجھتی ہے۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

عقائد الاسلام قاسمی

مذہب اور اسلام کیا چیز ہے

سب سے پہلا فرض ہمارا یہ ہے کہ ہم اسلامی عقیدے کے ذکر کرنے سے پہلے تمہیں یہ بتلائیں کہ مذہب کسے کہتے ہیں اور اسلام کیا چیز ہے جب تم مذہب کی اور اسلام کی تعریف سے پوری طرح واقف ہو جاؤ گے ساتھ ہی میں یہ بھی جان جاؤ گے کہ عقیدہ کے معنی کیا ہیں اور اس کی اہمیت کیا ہے تو اس کے بعد پھر تمہارے لیے مذہب کی ہر بات کا سمجھ لینا آسان ہو جاوے گا اور تمہیں اس سلسلہ میں ایک بصیرت ہو جائے گی۔

مذہب عربی لغت میں طریقہ کو کہتے ہیں جسے انسان اختیار کرتا ہے: خواہ وہ طریقہ اچھا ہو یا برا اور اہل شریعت کی اصطلاح میں مذہب وہ طریقہ خاص ہے جو انسان کے فکر و عمل کو خدا تک پہنچا دے اور اس کی نجات کا ضامن ہو مذہب حق انسان میں چار چیزیں پیدا کرتا ہے۔

طاقت، تدبیر، مقصد کی عملی تڑپ۔ اور کامیابی۔ سارے احکام و مسائل اور تعلیمات کا حاصل یہی ہے کہ انسان اس عالم میں مادی و روحانی طاقت پیدا کرتے

ہوئے اس کا صحیح استعمال کرے۔ اس کی زندگی بایں نتیجہ و بامقصد ہو مقصد کی تڑپ اور اس کی لگن ہو اور وہ کامیابی سے ہمکنار ہو۔

مذہب کی دو قسمیں ہیں ایک مذہب حق دوسرا مذہب باطل پھر مذہب حق بھی دو قسموں پر مشتمل ہو سکتا ہے ایک مذہب کامل دوسرا مذہب ناقص۔

اسلام وہ مذہب ہے جو انسان کے فکر و عمل کو صحیح لائنوں پر چلا کر اسے جسمانی و روحانی دنیا میں بایں نتیجہ و بامراد فرماتا ہے اسلام مذہب حق بھی ہے اور کامل بھی ہے۔ اسلام کے علاوہ آج کوئی مذہب ایسا جامع نہیں ہے جو باعتبار اپنی تعلیمات کے اسلام جیسی جامعیت و جاذبیت اور کمال رکھتا ہو۔

اسلام ایک آخری دین ہے جو نبی آخر صلی اللہ علیہ وسلم کو آخری کتاب یعنی قرآن کریم کے ذریعہ عطا فرمایا گیا ہے اس کا دائرۂ نصیحت کل عالم کے لیے ہے اور اس کا دور قیامت تک ہے اس کے بعد نہ کسی آسمانی کتاب کے اس عالم میں نازل ہونے کی ضرورت باقی ہے نہ کسی مستقل یا غیر مستقل نبی کی اسلام کا اور حق کا منکر کافر ہے۔ اسلام کے جملہ احکام و مسائل کا سرچشمہ و سرِ منشا چار چیزیں ہیں۔ کتاب اللہ (قرآن) سنتِ رسول اللہ (حدیث)، اجماع (صحابہ)، قیاس (مجتہدین)، ان پر جو دلیل مبنی ہے وہ قطعی ہے ان کے علاوہ جو دلیل بھی ہے وہ ظنی ہے۔ اسلام ایمان سے عام ہے ہر مومن مسلم ہے مگر ہر مسلم کا مومن ہونا ضروری نہیں ہے۔ منافق فہرست مسلمین میں تو گنے جا سکتے ہیں۔ مگر فہرست مومنین میں ہرگز شمار نہیں ہو سکتے۔

ایمان کی دو قسمیں ہیں۔ ایمان اجمالی، ایمان تفصیلی۔ سابقہ کتب سماویہ پر اجمالی ایمان لانا کافی ہے۔ لیکن خدا کی آخری کتاب پر ایمانِ تفصیلی کی بھی ضرورت ہے ویسے

نفس ایمان و اسلام بھی نجات کے لیے کافی ہیں۔ البتہ نجاتِ کامل کے لیے ایمان تفصیلی و عمل مقبول کی یقیناً ضرورت ہے۔

زندگی اول و آخر

مذہبِ اسلام کی بنا مشاہدہ پر نہیں ہے بلکہ غیب پر ہے۔ اس کا بنیادی اصول یہ ہے جس پر بیشتر احکام و مسائل کی بنا رہے۔ انسان کی زندگی ایک نہیں بلکہ دو ہیں یا زندگی ایک ہے لیکن اس کے حصے دو ہیں۔ پہلا حصۂ زندگی وہ ہے جو ہماری پیدائش سے شروع ہوتا ہے اور مرنے کے وقت ختم ہو جاتا ہے جسے ہم حیاتِ مستعار یعنی چند روزہ مانگی ہوئی زندگی سے تعبیر کرتے ہیں۔ دوسرا حصۂ زندگی وہ ہے جو مرنے کے بعد سے شروع ہو جاتا ہے مگر پھر کبھی ختم نہیں ہوتا۔

چونکہ پہلا حصۂ زندگی بہت تھوڑا ہے دوسرا حصۂ زندگی بہت لمبا ہے اس لیے اصولی طور پر ہم کو پہلی زندگی میں عمل دوسری زندگی کا بہت زیادہ خیال کرنا چاہیئے بالخصوص جب کہ پہلی زندگی میں عمل ہے اور دوسری زندگی میں صرف اسی عمل کے نتیجے سامنے آنے والے ہیں چونکہ نتیجہ کا صحیح نکلنا موقوف ہوتا ہے عمل کے صحیح ہونے پر اس لیے یوں سمجھنا چاہیئے۔ کہ ہماری پہلی زندگی کے افکار و اعمال کی خوبی و خرابی کا دوسری زندگی پر اثر پڑنا لازمی و ضروری ہے اور پہلی زندگی دوسری زندگی کے لیے ایک بنیادی حیثیت لیے ہوئے ہے کما قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم الدنیا مزرعۃ الاخرۃ (دنیا آخرت کی کھیتی ہے)

اس صورت حال کے بعد غیبی عالم پر اعتقاد رکھنے کے لیے یہ ضروری ہو جاتا ہے کہ انسان ایسے پاکیزہ طریقے معلوم کرے جن کی وجہ سے اس کی پہلی زندگی سنور جائے تاکہ دوسری زندگی بھی اس کی خود بخود شاندار ہوتی چلی جائے۔ ہر نیکی کا پہلی زندگی میں اختیار کرنا پہلی اور دوسری زندگی کو جنت بنا لیتا ہے۔ ہر نیکی جنت کا ایک دروازہ ہے اور ہر برائی جہنم کا ایک دروازہ ہے۔

چونکہ عمل کی صحت فکر کی صحت پر موقوف ہے۔ اس لیے اس سلسلہ میں سب سے بڑی چیز عقیدہ کی درستگی ہے۔ اگر ایک شخص نیک اعمال ہے مگر عقائد اس کے درست نہیں ہیں تو وہ یقیناً بلاقصد و ارادہ بُرے اعمال سے قریب ہوتا چلا جائے گا۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے کسی عالی شان مکان کی بنیاد تو کج رکھی جائے اور خواہش یہ ہو کہ عمدہ کاریگر اس کی دیوار سیدھی بناتے چلے جائیں گے۔ ظاہر ہے کہ یہ ناممکن ہے۔

عقیدہ کی تعریف :

عقیدہ عقد سے ہے جس کے معنی باندھنے کے ہیں۔ چونکہ اکثر خیالات بچپن میں ماں باپ کی جانب سے بچوں کے ذہن میں باندھ دیئے جاتے ہیں۔ جس کی وجہ سے وہ ذہن میں اس قدر جم جاتے ہیں کہ پھر ان کا نکلنا آسان نہیں ہوتا اس لیے ایسے سب خیالات کو عقیدہ کہتے ہیں اور اصطلاحِ مذہب میں عقیدہ ان خیالات کا نام ہے جو دین و مذہب کے نام پر دل میں راسخ ہوں اور اس کی جمع عقائد ہے۔ اب صرف مذہبی خیالات اور طریقوں ہی کا نام عقائد ہے۔ جس سلسلے کو ہم شروع کر رہے ہیں خدا تمہیں ان سے فائدہ اٹھانے کی اور اپنے عقیدہ کو درست کرنے کی توفیق بخشے۔ آمین

طاہر بن احمد القاسمی کان اللہ لہٗ
یکم رمضان المبارک سنہ ۱۳۷۱ھ

عقیدۂ توحید باری تعالیٰ

خدا کا سچا تابعدار بننے کے لیے جس کا دوسرا نام مسلمان ہے دل سے اور زبان سے اور عمل سے چند اقراروں کی ضرورت ہے۔ ان میں سے پہلا اقرار ہے کہ اللہ ذوالجلال والاکرام تنہا اس کارخانہ عالم کا پیدا کرنے والا ہے۔ جس کا کوئی شریک نہیں اور جو بے مثل و بے نظیر و بے عدیل و بے شریک ہے جو ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہنے والا ہے وہی کل عالم کا مارنے والا بھی ہے اور وہی جلانے والا بھی ہے اور اسی کے ہاتھ میں ہر قسم کے نفع و ضرر کی باگ ڈور ہے اور اسی کا حکم سارے جہان میں جاری ہے اب اس کی تھوڑی سی تشریح بھی سن لو۔

یہ کارخانۂ عالم جہاں چاند، سورج، ستارے اپنے اپنے وقتِ مقررہ پر اپنا اپنا فرض بجالا رہے ہیں اور اپنی چمک دمک سے ہر ایک دیکھنے والے کو مبتلائے حیرت کیے ہوئے ہیں اور آگ پانی ہوا اور مٹی ہر روز نت نئی صورتیں اختیار کرتے ہوئے ہزار روپ بدلتے سدلتے رہتے ہیں اور جس کارخانۂ آب و گِل کا حال یہ ہے کہ :

کسی کا کندہ نگینہ پہ نام ہوتا ہے — کسی کی عمر کا لبریز جام ہوتا ہے
عجب سرائے ہے دنیا کہ جس میں شام و سحر — کسی کا کوچ کسی کا مقام ہوتا ہے

چنانچہ ایک وقت میں یہاں ایک چیز پہ بہار آتی ہے تو دوسرے وقت میں اسی کو یہاں خزاں کا بھی شکار ہونا پڑتا ہے۔ ایک جگہ مسرت کے شادیانے بجتے ہیں تو دوسرے وقت میں اسی جگہ صفِ ماتم بھی بچھی نظر آتی ہے۔ غرض آسمان سے لے کر زمین تک جس چیز کو بھی دیکھئے وہ تغیر سے اپنے کو بچانے پر قدرت لیے ہوئے نہیں ہے۔ یہ سب آبادی و بربادی کے بدلتے سدلتے حالات و تغیرات بزبانِ حال

بتلا رہے ہیں کہ ان سب کی باگ ڈور ایک زبردست قوت کے ہاتھ میں ہے اور یہ کہ یہ کارخانۂ ہستی خود بخود پیدا نہیں ہو گیا ہے بلکہ اس کا چلانے والا اور پردۂ عدم سے ہر ایک وجود کو منصۂ شہود پہ لانے والا ضرور کوئی مالک و مختار ہے۔

پھر اس کارخانہ کی خوبیٔ انتظام سے اس کا بھی پتہ چلتا ہے کہ اس کا مالک ایک ہی ہو سکتا ہے دو یا چار نہیں ہو سکتے اور اس لیے نہیں ہو سکتے کہ چند خدا یا تو آپس میں برابری رکھنے والے ہو سکتے ہیں یا آپس میں ایک دوسرے سے کم و بیش اختیار رکھنے والے کہے جا سکتے ہیں اگر چند برابر کے خدا تسلیم کیے جاویں گے تو اس شکل میں تو ان چند خداؤں کے درمیان جھگڑے کا ہونا ضروری ہو گا۔

مثلاً ایک خدا بارش برسانے کی تجویز کرے گا۔ دوسرا خدا بوجہ مساوی درجہ رکھنے کے پانی برسنے کی مخالفت کرے گا۔ اس شکل میں تو کارخانۂ عالم کا چلنا ہی غیر ممکن ہو جائے گا۔ اور اگر چند خدا ایک دوسرے سے اختیارات میں کم و بیش تسلیم کیے جائیں گے تو اس دوسری شکل میں چھوٹا خدا بڑے خدا کے تابع رہے گا۔ جب تک بڑے خدا کی منظوری نہ ہو جائے گی اس وقت تک کوئی انتظام ہی نہ ہو سکے گا۔ اور یہ سب ہی جانتے ہیں کہ جو کسی سے کمتر ہوتا ہے وہ اپنے سے بڑے کا محتاج ہوا کرتا ہے۔ نیز خدائی میں اور احتیاج میں ضد اور بیر ہے۔ دونوں ایک جگہ جمع ہی نہیں ہو سکتے اس لیے آخر میں چار و ناچار یہی ماننا پڑے گا کہ اس کارخانۂ ہستی کا چلانے والا اور اس کا مالک ایک ہی خدا ہو سکتا ہے دو یا چار نہیں ہو سکتے اسی تسلیم شدہ کلیہ کی بنا پر یہ بھی ماننا پڑے گا کہ آگ، پانی اور مٹی کو بھی ہم خدا کی طرح قدیم کہہ سکتے ہیں نہ خدا کے لیے یہی تسلیم کر سکتے ہیں کہ وہ کارخانۂ

عالم کو چلانے میں ان چاروں عنصروں کا محتاج ہے نہ یہی قابلِ تسلیم ہوسکتا ہے کہ یہ چاروں مذکورہ بالا عنصر ہمیشہ سے ہیں اور خدا کی طرح قدیم ہیں کیونکہ اگر ان کے لیے بھی خدا کی طرح قدامت مان لی جاوے تو پھر ایک کی بجائے پانچ خدا ہو جائیں گے یہ بھی نہیں کہا جاسکتا کہ انہی کے الٹ پلٹ ہونے سے یہ سب کارخانہ چل رہا ہے اس صورت میں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ جو ان میں ضد ہے یہ کس نے ان میں پیدا کی ہے پس جو اس ضد کا خالق قرار دیا جاوے گا وہی ان کا خدا ہوگا۔

ان سب وجوہاتِ مذکورہ بالا کی بناء پر یہی تسلیم کرنا ناگزیر ہے کہ اس کارخانۂ عالم کا بنانے والا اور اس کو خوبی و خوش اسلوبی سے چلانے والا مختار مطلق ایک ہی ہوسکتا ہے۔ دو یا اس سے زائد نہیں ہوسکتے اور یہ بھی کہ نہ کوئی اس کا ہم پلہ و ہمسر ہے اور نہ اس کی خدائی میں اس کا کوئی شریک و سہیم ہی ہے نہ وہ کسی سے جنا گیا ہے اور نہ اس نے کسی کو جنا ہے وہ تمام کائنات سے الگ ان سب کا پیدا فرمانے والا معبود و مقصودِ حقیقی ہے اور عناصر اربعہ اس کی چار صفتوں کے عکس اور ظلِ ہیں۔ چنانچہ آگ اس کے غضب و جلال کا اور غرور کبریائی و حیات کا ایک پرتو ہے تو مٹی اس کی ہمہ گیری اور قدرت بے پایاں کی ایک مادی جھلک ہے پانی اس کے ناپیدا کنار علم کا ایک موج در موج منظر ہے تو ہوا اس کے لطیف و مخفی وجودِ بے زوال و بے مثال کا ایک مرقع نادیدنی ہے خوب سمجھ لو! ہر ایک موجود اور پیدا ہونے والے کے لیے اس کے پیدا کرنے والے کا ہونا ضروری ہے جیسے ہر فعل کے لیے اس کا فاعل ہونا لازمی ہے یا جیسے کتابت کے لیے کسی کاتب کا ہونا یقینی ہے یا جیسے ایک مکان کے لیے کسی کاریگر کا تسلیم کیا جانا ناگزیر ہے۔ اسی طرح سے کل

کائنات کے لیے ایک فرمانروا کارساز و حاکمِ مطلق اور خلاقِ بے پایاں کا ہونا بھی ایک امرِ یقینی و بدیہی ہے جیسے بغیر کاتب اور بغیر فاعل کے کتابت اور فعل صادر نہیں ہوسکتا اسی طرح سے دنیا میں جتنی بھی مصنوعات و موجودات پائی جاتی ہیں ان سب کا بھی ایک ہی صانع کردگار ہونا ضروری و یقینی ہے۔

بلاشبہ وہ نہ کسی آنکھ سے دیکھا جاسکتا ہے نہ کسی کان سے آواز سنا ہی جاسکتا ہے۔ نہ کسی ہاتھ سے چھوا ہی جاسکتا ہے۔ نہ کسی زبان سے چکھا ہی جاسکتا ہے مگر روح کی طرح سے باوجود آنکھوں سے نہ دیکھنے کے اس کے وجودِ پاک کا انکار بھی نہیں کیا جاسکتا وہ ذات غیر محدود نہ کسی وجود مستعار میں سما سکتی ہے نہ اس کا کوئی جزو ہی بن سکتا ہے۔ وہ ہر جگہ حاضر و ناظر ہے۔ دلوں کے مخفی بھیدوں پر مطلع ہے اس کی قدرتِ کاملہ سے کوئی چیز باہر نہیں ہے۔ وہی مارنے والا ہے اور وہی اسباب کی دنیا میں پس پردہ ہر ایک مخلوق کو دوسری مخلوق کے ذریعہ رزق پہنچا کر سب کا پالنہار بھی ہے وہ نہ جسم ہے نہ عرض ہے نہ جوہر ہے نہ دکھ سکھ رنج و راحت اور لذت و تلخی وغیرہ ہر قسم کی تکالیف اور عیوب و نقائص سے اس کو دور کا بھی واسطہ نہیں ہے۔

الغرض ذات بے دلیل و بے نظیر و بے شریک کے علاوہ جتنی بھی چیزیں دنیا میں ہیں وہ سب حادث ہیں اور ان کے مجموعہ کا نام عالم ہے جو ایک حالت سے دوسری حالت کی طرف اور ایک زمانہ سے دوسرے زمانہ کی طرف بدلتا سدلتا رہتا ہے قدیم بالذات صرف ذات وحدہٗ لاشریک ہی ہے جس کی نہ کوئی ابتداء ہے نہ جس کے لیے کوئی انتہاء ہے نہ جس کے لیے کوئی جہت ہے نہ جس کے لیے کوئی مکان و زمان ہے وہ ہر قسم کی حدود و قیود سے پاک ہے اسی لیے وہ اپنے لیے اول بھی ہے اور وہی اپنے لیے آخر

آخر بھی ہے جو ہوا اُسی کے حکم سے ہوا جو ہو رہا ہے اسی کے حکم سے ہو رہا ہے جو ہوگا اسی کے حکم سے ہوگا۔ اسی نے کُن سے تمام دنیا کو پیدا کیا۔ یعنی اس نے کہا فلاں چیز ہو جائے بس وہ موجود ہو گئی۔ اسی طرح جب وہ فرماتا ہے کہ نہ ہو پس اسی آن ہوت ناہوت سے بدل جاتی ہے۔ حکم اسی کا ہے اور اسی کو اَبدی طور پہ سزاوار بھی ہے۔

صفاتِ باری تعالیٰ

یہ بحث تو اس کی ذات کے متعلق تھی۔ اب اس کی صفاتِ بے تعداد کے متعلق سنیئے اس ذات بے چوں و بے چگوں کے لیے بے شمار صفتیں بھی ہیں۔ چنانچہ یہ جو عالم کی وَحدت میں کثرت نمایاں نظر آتی ہے اور ہر کثرت بالآخر نقطۂ وحدت ہی پہ جاکر دم لیتی ہے۔ اس کا سبب حق تعالیٰ کی صفاتِ کثیرہ ہی ہیں۔ اس کی صفتیں دو قسم کی ہیں۔ ایک صفاتِ حقیقی جو ہمیشہ سے ذاتِ واجب تعالیٰ کے ساتھ لازم ہیں۔ دوسری وہ صفتیں ہیں جو اضافی ہیں یعنی کبھی پائی جاتی ہیں اور کبھی نہیں پائی جاتیں۔

صفاتِ حقیقی یہ ہیں:۔

وجود حیات علم قدرتِ ارادہ سمع لبصر جو کسی وقت اس سے جدا نہیں ہوتی اور اضافی صفتیں مثال کے طور پہ مارنا اور جِلانا ہیں۔ صفاتِ حقیقی نہ خدا کی عین ذات ہیں نہ غیرِ ذات ہیں۔ ہر اچھی صفت کہیں ہو اور کسی میں ہو صفاتِ الٰہی ان کا سرچشمہ قرار پائیں گی اور ہر بری صفت صفاتِ الٰہی سے خارج اور ان کی ضد متصور ہو گی صفات نہ عین ذات ہیں نہ غیرِ ذات ہیں۔

افعالِ باری تعالیٰ

فاعلِ حقیقی یعنی کرنے والا صرف اللہ ہے اس کے علاوہ جتنے بھی فاعل ہیں وہ سب مجازی ہیں۔ اور اس لیے

مجازی فاعل ہیں کہ وہ خود اپنے وجود میں محتاجِ غیر ہیں ان کا وجود خود ان کے حق میں ذاتی نہیں ہے۔ بلکہ حق تعالیٰ کا بخشا ہوا ہے۔

اللہ اپنے ہر کام میں مختارِ مطلق ہے وہ اپنے کسی کام میں کسی کا محتاج نہیں ہے وہ پل بھر سے بھی کم میں ہر کام کو کرنے پہ قادر ہے ہر آن اس کی ایک نئی شان ہے جیسے ذات وصفات الٰہی غیر محدود ہیں اسی طرح افعال الٰہی بھی غیر محدود ہیں۔

جن اور فرشتوں کے متعلق اسلامی عقیدہ

ایک خدا پرست خداشناس انسان کے لیے دوسرا اقرار یہ ہے کہ جس طرح سے وہ بِن دیکھے خدا پہ ایمانِ بالغیب لایا ہے اسی طرح سے وہ خدا کی پیدا کی ہوئی نورانی مخلوق اور اس کے سراپا نور لشکر پہ بھی ایمان لائے جن کو فرشتہ کہتے ہیں۔ یہ نورانی مخلوق نہ کھاتی ہے نہ پیتی ہے نہ سوتی ہے نہ شادی بیاہ ہی سے اسے کوئی سروکار ہے اس کی غذا سمجھیئے تو صرف بندگی ورضائے الٰہی سمجھیئے اور اس کی پیاس سمجھیئے تو کلام الٰہی کے سننے کی آرزو سمجھیئے۔ چنانچہ جب بھی کسی جگہ ذکرِ الٰہی وکلامِ خدا پڑھا جاتا ہے تو وہاں فرشتوں کے ٹھٹھ کے ٹھٹھ لگ جاتے ہیں اس نورانی مخلوق میں چونکہ نفسانیت بالکل نہیں ہوتی اس لیے اس میں نافرمانی وسرکشی کا بھی مطلقاً کوئی مادہ نہیں ہے یہ سب تسلیم ورضا کے بندے ہیں ان کو جس خدمت پر لگا دیا گیا ہے وہ اسی پہ لگے ہوئے ہیں اپنی ڈیوٹی میں نہ خیانت کرتے ہیں نہ سہل انگاری سے کام لیتے ہیں ایک جماعت ان میں سے جنت کے انتظام پہ مقرر ہے دوسری جماعت دوزخ کی محافظ ہے کچھ ان میں عرشِ الٰہی کے اٹھائے والے ہیں اس نورانی مخلوق کی قدرت

کا حال یہ ہے کہ وہ ہر ایک نیک روپ دھار سکتی ہے چنانچہ بعض مرتبہ ہمارے رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے جبرئیل علیہ السلام انسان کی شکل و صورت میں بھی آئے ہیں۔ زمین و آسمان کی مختلف خِدمتوں کے لِحاظ سے اُصولی طور پر فرشتوں کی دو قسمیں ہیں جن کے سپرد زمین کی خدمتیں ہیں ان کو ملائکۃ الارض کہا جاتا ہے اور جن کے ذمہ آسمان کی خدمتیں ہیں ان کو ملائکۃ السماء کہا جاتا ہے جن فرشتوں کے ذمہ زمین کی خدمت متعلق ہے وہ زمین پہ رہ کر اپنا فرض ادا کرتے ہیں۔ مثلاً زمینی فرشتوں کی ایک جماعت بادلوں کو ہوا کے دوش پہ لانے اور زمین پہ برسانے کے لیے مقرر ہے۔ وہ سمندر سے بادلوں کو اٹھاتی ہے اور اسی خوبی سے ان کو زمین پہ برساتی ہے کہ ذرا کسی کو گراں نہیں ہوتا اگر بادل ایک دم زمین پر برس پڑا کرتے یعنی جو لاکھوں ٹن پانی ان کی پشت پہ لدا ہوا رہتا ہے وہ اچانک سب کا سب ایک ہی دفعہ برس جایا کرتا تو زمین پہ آج کوئی بستی بھی نظر نہ آتی اور پانی کے وزن سے سب کے سب دب کر فنا ہو جایا کرتے۔ دوسری جماعت فرشتوں کی زمین سے رزق اگانے پر مقرر ہے۔ تیسری جماعت کا کام یہ ہے کہ وہ رزق کو اس کے وقتِ مقررہ پر پکاتی ہے وغیرہ وغیرہ۔

فرشتوں کی عبادت کا حال یہ ہے کہ ایک جماعت ہمہ وقت اپنے آسمانی قبلہ (بیت المعمور) کے چاروں طرف مدتہا مدت سے چکر کاٹ رہی ہے اور طواف میں مشغول ہے تو دوسری جماعت قرنہا قرن سے سجدہ و رکوع میں خدا کی حمد و ثناء بیان کرنے میں لگی ہوئی ہے کچھ فرشتے وہ ہیں جو خدا کے عرش کو اٹھانے والے ہیں اور اس کے ارد گرد تسبیح و تہلیل میں مصروف ہیں یوں تو ہر فرشتہ بلحاظ اپنی پاکیزگی

و کرامت کے اپنی نظیر آپ ہے۔ لیکن چار فرشتے سب فرشتوں میں بزرگ ترین فرشتے قرار دیئے گئے ہیں۔

اوّل جبرئیل علیہ السلام جن کے ذمہ تمام انبیاء و رسولوں پہ خدا کے حکم سے وحی کا لانا تھا۔ چنانچہ قرآن کریم کے مکمل طور پہ نازل ہونے تک وہ خود بہ نفسِ نفیس اپنے اس فرض کو پورا کرتے رہے اس کے بعد ان کا زمین پہ آنا، وحی لانا بند ہو گیا۔

دوم میکائیل علیہ السلام جو خدا کے حکم سے زمین پہ مینہ برسانے کا کام معہ اپنے ماتحت فرشتوں کے سرانجام دیتے ہیں اور مخلوق کو رزق پہنچاتے ہیں۔

سوم اسرافیل علیہ السلام جو قیامت کے قریب صور پھونکیں گے جس کی وجہ سے زمین و آسمان پھٹ پڑیں گے اور حشر و نشر کے ہونے پہ قبروں وغیرہ سے مردے زندہ ہو کر اپنا حساب کتاب چکائیں گے اور اپنے اعمال کا صِلہ پائیں گے۔

چوتھے عزرائیل علیہ السلام، ان کا لقب ملک الموت ہے۔ ان کی ڈیوٹی یہ ہے کہ وہ اپنے مددگاروں کے ہمراہ مخلوق کی جان اس کے جسم سے نکالتے ہیں۔ ملک الموت بھی دوسرے فرشتوں کی طرح سے اپنی خدمت پہ اس قدر مستعد ہیں کہ جب کسی شخص کی موت کا وقت آپہنچتا ہے تو قبضِ روح کے لیے نہ وہ ایک پل کم کرتے ہیں نہ زیادہ بلکہ ٹھیک وقت پہ جس طرح سے جس کی جان کے نکالنے کا حکم ہوتا ہے اسی طرح سے نکالتے ہیں۔

حدیث میں ہے جب سب بنی نوع انسان وغیرہ نفخِ صُور کے بعد مر جائیں گے تب ملک الموت ابلیس کی رُوح قبض کرنے کی طرف متوجہ ہوں گے یہ ملعون چاروں طرف بھاگا پھرے گا۔ ملائکہ آگ کے گرزوں سے مار مار کر اس کو لوٹائیں گے

کا حال یہ ہے کہ وہ ہر ایک نیک روپ دھار سکتی ہے چنانچہ بعض مرتبہ ہمارے رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے جبرئیل علیہ السلام انسان کی شکل وصورت میں بھی آئے ہیں۔ زمین و آسمان کی مختلف خدمتوں کے لحاظ سے اصولی طور پر فرشتوں کی دو قسمیں ہیں جن کے سپرد زمین کی خدمتیں ہیں ان کو ملائکۃ الارض کہا جاتا ہے اور جن کے ذمہ آسمان کی خدمتیں ہیں ان کو ملائکۃ السماء کہا جاتا ہے جن فرشتوں کے ذمہ زمین کی خدمت متعلق ہے وہ زمین پہ رہ کر اپنا فرض ادا کرتے ہیں۔ مثلاً زمینی فرشتوں کی ایک جماعت بادلوں کو ہوا کے دوش پہ لانے اور زمین پر برسانے کے لیے مقرر ہے۔ وہ سمندر سے بادلوں کو اٹھاتی ہے اور اسی خوبی سے ان کو زمین پہ برساتی ہے کہ ذرا کسی کو گراں نہیں ہوتا اگر بادل ایک دم زمین پر برس پڑا کرتے یعنی جو لاکھوں ٹن پانی ان کی پشت پہ لدا ہوا رہتا ہے وہ اچانک سب کا سب ایک ہی دفعہ برس جایا کرتا تو زمین پہ آج کوئی بستی بھی نظر نہ آتی اور پانی کے وزن سے سب کے سب دب کر فنا ہو جایا کرتے۔ دوسری جماعت فرشتوں کی زمین سے رزق اگانے پر مقرر ہے۔ تیسری جماعت کا کام یہ ہے کہ وہ رزق کو اس کے وقتِ مقررہ پہ پکاتی ہے وغیرہ وغیرہ۔

فرشتوں کی عبادت کا حال یہ ہے کہ ایک جماعت ہمہ وقت اپنے آسمانی قبلہ (بیت المعمور) کے چاروں طرف مدتہا مدت سے چکر کاٹ رہی ہے اور طواف میں مشغول ہے تو دوسری جماعت قرنہا قرن سے سجدہ و رکوع میں خدا کی حمد و ثناء بیان کرنے میں لگی ہوئی ہے کچھ فرشتے وہ ہیں جو خدا کے عرش کو اٹھانے والے ہیں اور اس کے ارد گرد تسبیح و تہلیل میں مصروف ہیں یوں تو ہر فرشتہ بلحاظ اپنی پاکیزگی

و کرامت کے اپنی نظیر آپ ہے۔ لیکن چار فرشتے سب فرشتوں میں بزرگ ترین فرشتے قرار دیئے گئے ہیں۔

اوّل جبرئیل علیہ السلام جن کے ذمہ تمام انبیاء و رسولوں پہ خدا کے حکم سے وحی کا لانا، تھا۔ چنانچہ قرآن کریم کے مکمل طور پہ نازل ہونے تک وہ خود بہ نفسِ نفیس اپنے اس فرض کو پورا کرتے رہے اس کے بعد ان کا زمین پہ آنا، وحی لانا بند ہو گیا۔

دوّم میکائیل علیہ السلام جو خدا کے حکم سے زمین پہ مینہ برسانے کا کام معہ اپنے ماتحت فرشتوں کے سرانجام دیتے ہیں اور مخلوق کو رزق پہنچاتے ہیں۔

سوّم اسرافیل علیہ السلام جو قیامت کے قریب صور پھونکیں گے۔ جس کی وجہ سے زمین و آسمان پھٹ پڑیں گے اور حشر و نشر کے ہونے پہ قبروں وغیرہ سے مردے زندہ ہو کر اپنا حساب کتاب چکائیں گے اور اپنے اعمال کا صلہ پائیں گے۔

چوتھے عزرائیل علیہ السلام، ان کا لقب ملک الموت ہے۔ ان کی ڈیوٹی یہ ہے کہ وہ اپنے مددگاروں کے ہمراہ مخلوق کی جان اس کے جسم سے نکالتے ہیں۔ ملک الموت بھی دوسرے فرشتوں کی طرح سے اپنی خدمت پر اس قدر مستعد ہیں کہ جب کسی شخص کی موت کا وقت آ پہنچتا ہے تو قبضِ روح کے لیے نہ وہ ایک پل کم کرتے ہیں نہ زیادہ بلکہ ٹھیک وقت پر جس طرح سے جس کی جان کے نکالنے کا حکم ہوتا ہے اسی طرح سے نکالتے ہیں۔

حدیث میں ہے جب سب بنی نوع انسان وغیرہ نفخِ صور کے بعد مر جائیں گے تب ملک الموت ابلیس کی روح قبض کرنے کی طرف متوجہ ہوں گے یہ ملعون چاروں طرف بھاگا پھرے گا۔ ملائکہ آگ کے گرزوں سے مار مار کر اس کو لوٹائیں گے

اور بڑی تکلیف سے اس کی روح قبض کریں گے پھر ایک وقت وہ ہوگا کہ جب موت کو بھی موت آئے گی جس کے بعد اہلِ جنت کو آبدی زندگی نصیب ہوگی۔ فرشتوں کی جماعت میں ایک جماعت کاتبین کرام بھی کہلاتی ہے اس جماعت میں سے ہر انسان کے لیے دو کاتب فرشتے مقرر ہیں جو اس کے دائیں اور بائیں رہ کر چوبیس گھنٹہ اس کی نیکیوں اور برائیوں کو قلم بند کرتے رہتے ہیں۔ صبح و شام ان کی ڈیوٹیاں تبدیل ہوتی ہیں۔ یہ نورانی مخلوق بوجہ اپنے مادہ کی لطافت کے ہماری ظاہری نگاہوں سے اوجھل رہتی ہے، مگر جیسے عقل و روح کی نورانیت اور ان کا موجود ہونا سب کے نزدیک مسلّم ہے۔ حالانکہ آج تک کسی شخص نے بھی ان کو نہیں دیکھا۔ یہی صورت فرشتوں کے وجود کی بھی ہے جن کی خبر خدا اور اس کے رسول نے دی ہے اور اسی بناء پر اس مخلوق کے وجود کو تسلیم کرنا ہمارا مذہبی فرض ہے۔

جنّ ایک مخلوق آگ سے بنائی گئی ہے اور اس کو جن کہتے ہیں یہ ناری مخلوق بھی بوجہ آگ کی لطافت کے ہم کو دکھائی نہیں دیتی۔ اس مخلوق میں سرکشی و نافرمانی کا مادہ بھی ہوتا ہے اور اپنے مادہ کی خاصیت کی بنا پر ایسا ہونا بھی چاہیئے کیونکہ آگ کا خاصہ ہی یہ ہے کہ وہ سر اٹھائے اور سوزش و جلن کو نتیجہ میں دکھلائے جنوں میں نیک اور بزرگ بھی ہوتے ہیں اور شریر و بدنفس بھی۔ یہ مخلوق بھی مختلف روپ دھار سکتی ہے انہیں میں ایک جن کا نام اِبلیس ہے جو انسان کی دشمنی میں اندھا ہو کر رہ گیا ہے اور ہمیشہ نسل آدم کی بیخ کنی میں سرگرداں رہتا ہے شیطان کی انسان سے دشمنی اور اس کے مردودِ بارگاہِ الٰہی ہونے کی وجہ یہ ہے کہ جب حق تعالیٰ نے آدم کو زمین پر اپنا نائب اور خلیفہ بنانے کا ارادہ ابلیس اور

فرشتوں کے سامنے ظاہر فرمایا اور حکم دیا کہ وہ آدم کے آگے سرِ و قد جھک جائیں اور سجدہ تعظیمی بجالائیں تو اس وقت سوائے اِبلیس کے سب فرشتوں نے آدم کو سجدہ کیا تھا۔ ابلیس نے یہ کہہ کر سجدہ سے انکار کر دیا تھا کہ میں آدم کو کیسے سجدہ کر سکتا ہوں جب کہ وہ مجھ سے کمتر ہے آدم کو مٹی سے پیدا کیا گیا ہے اور مجھے آگ سے بنایا گیا ہے آگ کو مٹی پر بوجہ اس کی جودت و لطافت کے کھلی فوقیت حاصل ہے اس لیے زمین کی خِلافت کا حقدار تو میں ہوں نہ کہ آدم۔ چونکہ ابلیس نے خدا کے مجوزہ پروگرام میں نقص نکالا حکم عُدولی کی اور سرا ونچا کیا۔ ساتھ ہی کم عقلی کا بھی ثبوت دیا۔ اس لیے وہ ہمیشہ کے لیے مردودِ بارگاہ ہوا اسے خدا کی جانب سے حکم ہوا کہ وہ آسمانوں سے نکل جائے شیطان انسان کا جانی دشمن ہے۔ شیطان نے اس وقت خدا سے نسل بنی آدم کی موجودگی تک اپنی زندگی کے لیے مہلت مانگی تھی جس کو منظور کیا گیا۔ ابلیس نے تو یہ مہلت اس لیے مانگی تھی کہ آدم کی دشمنی کا اُسے خوب موقع مل سکے تاکہ شیطان بنی نوع انسان کو اپنی راہ چلا کر اپنے ہی جیسا بناتے ہوئے اس کو بھی مردودِ بارگاہ بنا دے اور حق تعالےٰ نے یہ مہلت شیطان کو اس لیے دی کہ شیطان انسان کو شر کا راستہ دکھائے گا۔ انبیاء اور ان کے جانشین انسان کو خیر کا راستہ دکھائیں گے۔ اس کے بعد خیر کا راستہ اختیار کر لینے پر شیطان کی دشمنی بھی انسان کے حق میں ترقیٔ کمالات کا ذریعہ بن جائے گا۔

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ خدا نے تین قسم کی مخلوق پیدا کی ہے۔ ایک نور سے جسے فرشتہ کہتے ہیں۔ دوسری نار سے جسے جن کہتے ہیں تیسری مٹی سے جسے حیوان و انسان وغیرہ کہتے ہیں۔ انسان میں چونکہ نور و نار کے اجزا بھی رکھے گئے ہیں اِس

لیے اسے تمام مخلوق پر عزت و کرامت بخشی گئی ہے ۔ یہ صلاحیت قدرت نے صرف مٹی ہی میں رکھی ہے کہ وہ آگ اور پانی جیسے متضاد عنصروں کو اپنے اندر کھپالیتی ہے آگ کا یہ حوصلہ کہاں ہے کہ وہ دوسرے عناصر کو اپنے اندر جمع کر سکے ۔شیطان اگر انسان کی اس جامعیت کو سمجھ لیتا تو کبھی سرادنچا نہ کرتا ۔

فرشتے اور جن اتنی قوی روحیں رکھتے ہیں کہ اپنے تصرّف سے ہر ایک صورت اپنے لیے بنا سکتے ہیں اور دنیا کے ہر مقام پر چشم زدن میں پہنچ سکتے ہیں ۔فرشتے نر و مادہ کی تقسیم نہیں رکھتے ۔ فرشتے عالمِ عَلوی کی اہم مخلوق ہیں جو عالمِ اَسفل کے لیے مُدَبّر و منتظم بنائے گئے ہیں ان کی تعداد سوائے خدا کے کوئی نہیں جانتا ۔ وہ آسمان و زمین میں ستاروں کی طرح بِکھرے اور پھیلے ہوئے ہیں ۔

اُصولی طور پر ملائکہ کی دو قسمیں ہیں (۱) ملائکہ تربیت کے سرگروہ جبرئیل و میکائیل ہیں اور ملائکہ ہلاکت کے سرگروہ عزرائیل و اسرافیل ہیں ۔

عالم کی حقیقت اور اس کی تعریف

تیسرا اقرار ہمارے لیے یہ ضروری ہے کہ ہم عالم کو حادث اور مخلوق مانیں اس کو قدیم بالذات نہ جانیں ۔یعنی ہمارا ایمان یہ ہونا چاہیئے کہ حق تعالیٰ کے علاوہ جس قدر بھی دنیا میں چیزیں پائی جاتی ہیں ان سب کے مجموعہ کا نام عالم ہے جو خود سے پیدا نہیں ہو گیا ہے بلکہ اس کو خدا نے پیدا کیا ہے عالم کے لیے اصولی طور پر روح اور مادہ بمنزلہ بنیاد و اساس کے ہیں ۔لیکن وہ بھی باوجود اپنی اس قدر اہمیت کے حادث اور مخلوق ہیں ۔

عالم کی پیدائش کی ترتیب یہ ہے :

سب سے اوّل حق تعالیٰ نے نورِ عقل کو پیدا فرمایا ۔جس کا دوسرا نام حقیقتِ محمدیہ ہے ۔اس کو تمام عالم کے لیے مدبر اور وجہ شرافت بنایا ۔ اسی لیے تمام فرشتوں کو اس کے آگے جھک جانے کا حکم ہوا ۔ خدا کے بعد درجہ عقلِ اوّل یعنی حقیقتِ محمدیہ کا ہے ۔اسی لیے جس مخلوق میں یہ نورِ عقل نہیں جبکہ وہ مخلوقِ عالم کی صفِ اوّل میں بھی جگہ نہیں پا سکتی ۔

معلوم ہوا کہ نورِ محمدیؐ بلحاظِ خلقت سب سے اوّل ہے اور بلحاظ ظہور سب سے آخر ہے اسی لیے نورِ محمدی کا اوّل و آخر نورِ خدا تو ہو سکتا ہے ، لیکن اور کسی کے نورِ نبوت یہ منصب نہیں ہو سکتا ۔ نہ حضور خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کسی نبوت کا وجود تسلیم کیا جا سکتا ہے اور اگر تسلیم کیا جائے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ ایسے منکر گروہ نے حقیقتِ محمدیہؐ کی اولیّت سے بھی انکار کر دیا ہے ۔

نورِ عقل کو پیدا فرمانے کے بعد حق تعالیٰ نے لوح و قلم اور مادہ و روح عرش و کرسی کو پیدا کیا ۔پھر حق تعالیٰ نے جن اور فرشتے ، جنت و دوزخ ، زمین و آسمان ، چاند اور سورج اور دیگر بے شمار کواکب و ستارے وغیرہ پیدا فرمائے ۔ زمین و آسمان وغیرہ کو چھ دن میں بنایا گیا ۔ ساتویں دن حق تعالیٰ نے عرش پر نمودار ہو کر کل کائنات پر اپنی قدرت اس کارخانہ عالم کو پل بھر سے بھی کم میں بنانے پر قادر تھی ۔ لیکن ایک سبب دوسرے سبب سے کبھی ملتا ہے اور کبھی جدا ہوتا ہے ۔ یہاں کبھی جوڑ ہے کبھی توڑ ہے ۔کبھی علم ہے تو کبھی جہل ہے ۔کبھی نور ہے تو کبھی ظلمت ہے اس لیے حق تعالیٰ نے عالمِ اسباب کی حقیقت کی رعایت کے پیش نظر تدریج اور وقفہ سے کام لیا اور اس ناظرو قت کو بھی جنم دیا ۔ یہ دنیا ہی ایک جہان نہیں اس جیسے خدا جانے کتنے جہان

اور ہیں جن کی صحیح تعداد کا علم خدا ہی کو ہے ۔ ہم تو اُصولاً اس بارے میں اتنا ہی
سکتے ہیں کہ خدا کی ہر ایک صفت اور شان اپنے لیے ایک مستقل عالم کا درجہ رکھتی
عالم بمنزلہ آئینہ کے ہے جس میں کمالاتِ خداوندی کے آفتاب و ماہتاب چمکتے ہیں
ہر ایک صفت اپنے آئینہ میں اپنی نرالی شان و شکوہ کو چمکاتے ہوئے ہے ان سارے
جہانوں میں سے تین عالم بہت اہمیت رکھتے ہیں :-

اوّل عالمِ ناسوت ، جس کا دوسرا نام عالمِ اسباب و مادیات ہے جس کی تربیت
خدا کی صفتِ ربوبیت فرماتی ہے ۔

دوم عالمِ ملکوت ، جو فرشتوں وغیرہ کا عالم ہے ۔ جس کی تربیت خدا کی صفت
ملکیت فرماتی ہے ۔

سوم عالمِ لاہوت ، جس کا دوسرا نام ہُو کا عالم ہے اور جس جہاں سے مقرب
بارگاہِ سبحانی وابستہ ہیں جس کی تربیت خدا کی صفتِ الوہیت فرماتی ہے ان تینوں جہانوں
کا وقت اور ان کی ساعتیں بھی مختلف ہیں ۔

وقت کی قدر و قیمت

عالمِ ملکوت کی ایک ساعت عالمِ ربوبیت کی
ہزار ساعتوں کے برابر ہے اور عالمِ لاہوت
کی ساعت اس سے بھی دو چند اور سہ چند ہے ۔ ان تینوں جہانوں کی ساعتوں میں
باہم وہی نسبت ہے جو خود ان تینوں جہانوں میں ایک کو دوسرے سے نسبت فو
و تحت حاصل ہے ۔ ربوبیت کی ساعتیں چوبیس گھنٹے ہم پر سے گزرتی ہیں ۔ لیکن
انہی یہاں کبھی کبھی ملکوتی و لاہوتی ساعتیں بھی ملی جلی آتی رہتی ہیں جو اپنی کیفیت اور
قدر و منزلت ، عظمت و کرامت کے لحاظ سے اس جہان کے دنوں اور راتوں کی

بھی عبادت و بندگی کی نذر کر دیتی ہے ۔

جن مقدس مہینوں میں عالمِ علوی و عالمِ سفلی کے انوار و برکات کا باہم میل ملاپ
ہوتا ہے ۔ ان مقدس مہینوں کو اشہرِ حرم کہا جاتا ہے جو چار ہیں :-
رجب ، ذیقعدہ ، ذی الحجہ ، محرّم ، ان چار مہینوں کو خدا نے جس دن سے کہ
اس نے آسمان و زمین کو پیدا کیا ہے ۔ اس وقت سے ان کو بزرگی دے کر امت بخشی
ہے ۔ یہ چار مہینے فی الحقیقت خدا کے علم و قدرت اور حیات و قیام کی چار صفتوں
کے خاص مظہر ہیں ۔

اسی لیے دنیا میں جس قدر بھی معزز اور مکرم انسان ظاہر ہوتے ہیں ۔ ان کی ان چاروں
مہینوں میں یا بنیاد پڑتی ہے یا ان چاروں مہینوں میں ان کی پیدائش ہوتی ہے اگر
ان مقدس مہینوں میں کسی کا ظہور ہوتا ہے تو اس کے جسم پر جمال و جلال و کمال کے
اثرات آتے ہیں اور اگر ان چار مقدس مہینوں میں کسی کی بنیاد رکھی جاتی ہے تو اس
کے باطن میں ان چار مقدس مہینوں کے انوار و برکات کا اثر آتا ہے اس لیے اگر تم
چاہتے ہو کہ تمہاری نسل میں برکت و سلام آئے تو تم ان چار مہینوں میں خصوصیت
سے خوب دل لگا کر عبادت کیا کرو ۔ ان مہینوں میں اپنے نفس پر ظلم کرنے سے خصوصیت
سے بچا کرو اور اپنے جسمانی جوہر کی مکمل حفاظت کیا کرو ۔ شادی بھی انہی مبارک مہینوں
میں کیا کرو ۔ کیونکہ جب آسمان و زمین کے انوار و برکات کا ان چاروں مہینوں میں
باہم میل ملاپ ہوتا ہے تو انسانوں کا جائز میل ملاپ بھی ان مقدس مہینوں میں کیوں
نہ ہو ۔ جو لوگ ان بزرگ مہینوں میں بھی حرام کاری سے باز نہیں آتے وہ نتیجہ میں ہمیشہ
ملعون و مردود ٹھہرتے ہیں ۔ ان اوقات میں ملکوتی و لاہوتی ساعتیں آتی ہیں ۔ ایک

ایک ساعت بعض دفعہ ایک ایک قرن اور صدی کا خُلاصہ اپنے اندر لیے ہوئے ہوتی ہے۔ اس لیے ان مہینوں میں گناہوں سے بہت بچا کرو۔ اگر خدانخواستہ کسی بزرگ ساعت میں کسی سے کوئی گناہ صادر ہو کر اس کی پکڑ ہو جائے تو بعض اوقات تمام تمام عمر انسان محض ایک ساعت کے گناہ میں پکڑا ہوا رہتا ہے۔

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ جب عالم ظاہر و محسوس کی عام ساعتیں کارفرما ہوتی ہیں تو ہمارے تمہارے جیسے معمولی انسان پیدا ہوتے ہیں اور جب عالم ملکوت و لاہوت کی ساعتیں کارفرما ہوتی ہیں تو اس وقت کلیدی لوگ دنیا میں نمودار ہوتے ہیں۔ یہ جو ہمیں عبادت و ریاضت نفس کا حکم دیا گیا ہے اس کی غرض و غایت فی الحقیقت یہی ہے کہ ہمارے نفس میں اعتدال و کمال پیدا ہو جائے۔ تاکہ اس کے بعد جب ہماری ازدواجی زندگی شروع ہو تو ہمارے ذریعہ سے بہتر سے بہتر انسانی قلب تیار ہو کر اعلیٰ سے اعلیٰ روحوں کی دنیا میں آنے کا سامان ہو۔ یہ جو آج ہم بے زور دبے پڑے بے جوہر اور بے کمال بے زر بے وسیلہ ہیں اس کی وجہ صرف یہی ہے کہ ہم لوگ نفس کے بندے بن گئے ہیں اور اپنے جوہر کو نہایت بے دردی سے ضائع کرتے ہیں۔ خدا کی نعمتوں سے ناجائز فائدے اٹھاتے ہیں۔ اسی لیے عالم عَلوی کی پھٹکار ہم پر پڑتی ہے اور آج ہم ساری دنیا کی قوموں کے مقابلہ میں ذلیل و خوار ہیں۔ آج نہ ہمارے پاس جوہر جسمانی کی نعمت ہے نہ اب ہمیں حکومت ہی سزاوار ہے وجہ اس کی یہی ہے کہ ہم نے اپنی نفسانی قوتوں کو شتر بے مہار بنا کر چھوڑ دیا ہے بہتر سے بہتر ہم پر سے گذرتی ہیں اور ہمیں قسم قسم کے گناہوں میں مبتلا دیکھ کر ہم سے کنارہ کر جاتی ہیں اسی لیے شیطان کو زیادہ سے زیادہ ہم پر وار کرنے کے موقعے ملتے ہیں۔

ہم کو چاہیے کہ ہم زمانہ کے اور وقت کے تیور پہچانیں اچھے اور برے اوقات کا فرق جانیں اور ہر وقت کے مناسبِ حال ان سے فائدہ اٹھانا سیکھیں جو شخص ان مقدس مہینوں کی قدر نہیں پہچانتا یوں کہنا چاہیئے کہ وہ فی الحقیقت نعمتوں کو اپنے ہاتھوں سے دھکے دیتا ہے۔

عالم کی قسمیں

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ عالم کے دو حصّے ہیں۔ ایک اعلیٰ دوسرے اسفل۔ عالم کے بالائی حصّہ کو عالم علوی کہتے ہیں اور زیریں حصّہ کا نام عالمِ سفلی ہے۔ حصّہ زیریں میں تاریکی ہے اور حصّہ اعلیٰ میں نور ہے۔ فنا دونوں کے لیے ہے۔ لیکن پہلے حصّہ اسفل فنا ہو جائے گا اور اس کے بعد حصّہ اعلیٰ کا نمبر آئے گا۔

عالمِ محسوس فانی ہے عالم معقول غیر فانی ہے۔ عالم عَلوی عالم سفلی پہ حاکم ہے اسی لیے عالم سفلی کے حق میں عالمِ عَلوی سے مناسبت و مشابہت پیدا کرنا اس کا سب سے بڑا کمال سمجھا جاتا ہے مگر دستِ فنا سے کوئی حصّہ نہیں بچ سکے گا۔

رُوح اور مادّہ

چوتھا اقرار ہمارے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ ہم روح اور مادّہ دونوں کو مخلوق اور حادث تسلیم کریں اور ان کو مخلوق اوّل و دوم سمجھتے ہیں خدائے قادر کے زیر تصرف جانیں۔ نیز ان کو کسی درجہ میں بھی خود پیدا ہونے والا قدیم بالذات نہ سمجھیں۔ اگر ہم بھی خدانخواستہ آریوں کی طرح سے روح اور مادہ کو خدا کی طرح سے قدیم اور غیر مخلوق سمجھ لیں گے تو اس کے معنی اس کے سوا کچھ نہ ہونگے کہ ہم نے معاذ اللہ قادرِ مطلق کو قادرِ مطلق کہہ کر مادہ عقیدہ مان لیا ہے اور مادہ کو قدیم بالذات کہہ کر ان کو خدا کا شریک ٹھہرا دیا ہے۔ نیز خدا کو مادہ

و روح کا محتاج قرار دے کر ہم نے خدا کی خدائی ہی سے انکار کر دیا ہے اس ناقص اور باطل عقیدہ کی رو سے تو خدا کا کام صرف یہ رہ جائے گا کہ مادہ و روح میں ترکیب دے دیا کرے اور بس۔ باقی ایجاد جو اصل چیز ہے اس شکل میں اس کی تو کلی نفی لازم آتی ہے اور خدائی کے لیے احتیاج مفت میں سر لینا پڑتی ہے اور مادہ و روح کو شریکِ خدائی ٹھہرانے کا گناہ علیحدہ ذمہ پڑتا ہے ایسے مجبور خدا کی تسلیم سے تو بہتر اس کا انکار ہے اور حقیقتہً یہ اقرار بھی انکار کے ہی ہم معنی ہے۔

یہ ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ جو چیز آپ سے آپ موجود ہو اور اس کا وجود اس کے حق میں واجب و کامل ہو ایسی ذات کے کمالات اور اس کے اوصاف کا غیر متناہی ہونا لازم اور ضروری ہوتا ہے۔ چنانچہ خدا کو خدا ہی اس لیے کہا جاتا ہے کہ اس کا وجود اس کے حق میں کامل اور ذاتی ہے عطائے غیر نہیں ہے باقی مادہ و روح تو کسی طرح بھی قدیم بالذات و غیر مخلوق نہیں قرار دیئے جا سکتے کیونکہ وہ دونوں حدبندی اور نقص کو قبول کرتے ہیں اور جو چیز محدود و ناقص ہوتی ہے وہ قدیم بالذات نہیں ہوتی۔ اسی قسم کی ناقص اور مشرکانہ تعلیم موجودہ عیسائی مذہب کی بھی ہے وہ بھی باپ بیٹا روح القدس تینوں کے مجموعہ کو خدا کہتے ہیں۔ ان کے نزدیک ایک تین ہیں اور تین ایک ہیں۔ ہندو شاستروں میں بھی اسی قسم کی تعلیم موجود ہے۔ ان کا خدا بھی تین قسم پر ہے۔

رج گن کے پیوند سے برہما ہوا۔ ست گن کے پیوند سے بشن ہوا۔ تم گن کے پیوند سے شب یعنی مہادیو ہوا۔

برہما پیدا کرنے والا ہے۔ بشن پالنے والا ہے۔ شب یعنی مہادیو فنا کرنے

والا ہے۔ ان کے نزدیک ساری دنیا کے کام انہی تینوں سے متعلق ہیں۔ یہاں بھی وحدت کا نام و نشان نہیں ہے۔ اسلام ایسے جملہ باطل عقیدوں کو توحید خالص کے منافی قرار دے کر ناجائز ٹھہراتا ہے اس کے نزدیک مادہ و روح کو قدیم بالذات ماننے پر توحید خالص کی تسلیم کی کوئی صورت ہی باقی نہیں رہتی نہ ایسا مجبور خدا جو روح اور مادہ کا محتاج ہو قادر مطلق ہی پکارا جا سکتا ہے۔ اسلام صرف اسی ذات واجب تعالیٰ کو خدا ماننے کو تیار ہے جو مادہ و روح کا خالق ہے۔

جو خدا ان دونوں کو پیدا نہیں کر سکتا وہ سارے جہان کا موجد بھی نہیں کہلا سکتا۔ نہ اس کو قادر علی الاطلاق ہی کہہ سکتے ہیں۔ اسلام کے نزدیک خدائے واحد ہی سب کا پیدا کرنے والا اور وہی سب کا پالنے والا ہے

غرض ایک ہی ذات کو ہر قسم کے اختیارات ہو سکتے۔ یہ اختیارات نہ تقسیم ہو سکتے ہیں نہ ان میں کسی کی شرکت ہی ہو سکتی ہے۔

رُوح کی قسمیں

مادہ و روح کی متعدد قسمیں ہیں۔ مناسب ہوگا کہ پہلے روح کی قسموں کا ذکر کیا جاوے۔ روح متعدد الاقسام شے ہے اس کی مختلف جہتوں سے مختلف قسمیں ہیں۔ مثلاً بلندی و پستی کے لحاظ سے ایک روح عَلوی کہلاتی ہے۔ دوسری روح سفلی کہلاتی ہے۔ پھر روح علوی و سفلی کی چند قسمیں ہیں۔ روح عَلوی میں روح مَلکی روح فلکی کی ہر دو نوعیں داخل ہیں۔ روح سفلی میں ایک قسم روح عنصری کی ہے۔ دوسری قسم روح حیوانی ہے پھر روح حیوانی کی بھی چند قسمیں ہیں مثلاً روح جنی، روح انسانی اور روح انسانی بھی باعتبار اپنے اعضاء جسم کے چند قسموں پر مشتمل ہے مثلاً ہاتھوں کی روح علیحدہ ہے۔ سینہ کی علیحدہ ہے اور آنکھ

ناک کان کی علیحدہ ہے ۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ روح کی دو قسمیں اور بھی ہیں ایک
روح کلی دوسرے جزی ۔ یہ تقسیم ہم نے اس لیے مانی ہے کہ مثلاً اگر خدانخواستہ کسی
شخص کے داہنے ہاتھ پر فالج کا حملہ ہو جائے تو اس ہاتھ کی جان نکل جاتی ہے پھر وہ
ایک مُردہ ہاتھ کہلاتا ہے ۔ ہاں بایاں ہاتھ البتہ جاندار کہلاتا ہے کیونکہ وہ اس مردہ
کے بالمقابل زندہ رہ کر حرکت کرتا ہے اگر علیحدہ علیحدہ اعضاء کی روح نہ ہوتی بلکہ ایک
ہی روح ہر ایک عضو کی مشترک ہوتی تو جب عضو پر فالج کا حملہ ہوا کرتا تو انسان مر
کرتا ۔ لیکن ایسا نہیں ہے ۔ البتہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ روح کے اصلی مستقر دل و دماغ
ہیں ۔ اس لیے بایں معنی روح سارے بدن کی ایک ہی ہے جو بدن کے ہر حصہ میں
جاری و ساری رہتی ہے ۔ اس کی اصل توجہ دل و دماغ پر رہتی ہے اسی لیے جب
کوئی مُہلک بیماری ان پر حملہ آور ہوتی ہے تو سارے جسم کی موت واقع ہو جاتی
ہے اور اگر ان کے علاوہ کسی عُضو پر حملہ ہوتا ہے تو صِرف اس عضو کی موت آتی ہے
سارے بدن کی نہیں آتی لیکن بایں ہمہ اس معنی کا کلی و جزی ہونا پھر بھی مسلم
ہے کہ تمام عالم کی رُوح کلی اور ہے ۔ روح کلی مجرّد ہے ۔ اس کا تعلق عالم سے صِرف
تدبیر و تصرف کا ہے ۔ وہ حلُول اور قیام وغیرہ سے بے نیاز ہے اور اَرواحِ جزئیہ
کو اجسام جزئیہ کفایت کر جاتے ہیں پھر جیسے کل کا اپنے اجزاء کی طرف متوجہ ہونا
ایک اَمر فطری ہے اسی طرح غیر معمولی ساعتوں میں روح عالم کی جلوہ نمائی اور اپنے
ماتحت کل اَرواح عالم کی طرف توجہ بھی ایک قدرتی بات ہے معلوم ہوا کہ قالبوں اور
جسموں کی نوعیت کے اختلاف سے روح کی اقسام وابستہ ہیں ۔
فرشتے چونکہ نورانی قالب رکھتے ہیں ۔ اس لیے ان کی روح بھی بہ نسبت ہمار

روحوں کے قوی ہوتی ہے اور جنوں کی روح بوجہ ناری قالب ہونے کے فرشتوں
کی روح سے تو کمزور ہوتی ہے ۔ مگر انسانوں کی رُوح سے قوی ہوتی ہے اور جمادات
و نباتات و حیوانات کی روح انسانی رُوح سے بھی کمتر شمار ہوتی ہے گو قوتِ مادی
کے لحاظ سے بعض جانور انسان سے کہیں زیادہ قوی ہوتے ہیں ۔

مادہ کی قِسمیں

مادہ کی بھی روح کی طرح سے چند قسمیں ہیں ۔ ۱۔ مادہ علوی ۔ ۲۔ مادہ سفلی ۔ ایک تقسیم مادہ کی یہ ہے ۔ مادہ
کلی ۔ مادہ جزی ۔ مادہ کثیف ۔ مادہ لطیف ۔ مادہ ظلمت ۔ مادہ نور ۔ مادہ فلکی ۔ مادہ
ارضی ۔ وغیرہ وغیرہ ۔ اس سلسلہ میں جو اصُول ہمیں ہاتھ لگا ہے وہ تو یہ ہے کہ مادہ کو
جس قدر بھی روح اول و اعلیٰ سے قرب و اتصال ہوتا ہے اسی قدر اس میں لطافت و
جُودت آجاتی ہے ۔ اور جس قدر اس کو روح اوّل و اعلیٰ سے دوری ہوتی ہے اسی قدر
اس میں کثافت و غلظت پیدا ہو جاتی ہے ۔
زمین کا جوہری مادہ وسطِ زمین ہے جہاں ہمیشہ سے خدا کی تجلیات برستی رہتی
ہیں اور جہاں خدا کے گھر کی چار دیواری سے اس کی چار صفتوں کی تجلیات کی طرف
اشارہ ہے اور پانچویں جہت سے ذات واجب کی طرف ہر آن درسِ حکمت دیا
جاتا ہے ۔
اسی طرح آسمان کا جوہری حصّہ وسطِ آسمان ہے جہاں خدا کے آسمانی گھر سے
ہمیشہ تجلیاتِ خداوندی آسمانی مادہ کو جِلا دیتی رہتی ہیں ۔ یہ جو ہر قسم کے پھلوں اور
پھولوں وغیرہ میں تم کچھ لطیف مادے پاتے ہو اور کچھ کثیف ۔ یہ فی الحقیقت ایک خاص
نظامِ قدرت کا پتہ دینے والے ہیں ۔ اجزائے لطیفہ وسط زمین سے کھینچ کر طبقاً عن

طلبق پھولوں اور پھلوں کی بہار بنتے ہیں اور اجزائے کثیفہ اطرافِ زمین سے کھینچ کر پھولوں اور پھلوں وغیرہ میں اجزائے لطیفہ کے محافظ بن کر غلاف اور پردہ کا کام کرتے ہیں کثیف مادوں سے مخلوق کا نچلہ حصّہ بنایا جاتا ہے جو جہنم کے مشابہ ہوتا ہے اور لطیف مادوں سے مخلوق کا اوپر کا دھڑ بنایا جاتا ہے جو جنت کے حق ہونے کا پتہ دیتا ہے۔

لوح و قلم

معلوم ہوا کہ مادہ کلی لوح الٰہی ہے جس پر اُس نے سب کچھ لکھ دیا ہے اور روح بمنزلہ حروف اور قلم کے ہے جو اس لوح مادیات پر ثبت ہے جب ہم اور آپ قلم ولادت پر انسانی خطوط کھینچ دیتے ہیں اور دو انسانوں کی سعی وصل و ملاپ سے کچھ ہی عرصہ بعد تیسرا انسان اس لوح و قلم کا نتیجہ بن کر صفحہ ہستی پر حروف کائنات کی شکل اختیار کرتے ہوئے نمودار ہو جاتا ہے چنانچہ تختی" کائنات پر حساب لکھنا شروع کر دیا جاتا ہے اور ایک عرصہ تک یہ حروف زندہ و کندہ رہ کر پھر مٹا دیئے جاتے ہیں اور سلیٹ جیسا پھر دوسرا حساب ہو جاتا ہے تو لوحِ دہر پر کلک قُدرت سے زمین و آسمان اور کل مخلوقات کا وجود ثبت ہونے کی تقسیم میں ہم کو کیا تامل ہو سکتا ہے جیسے ہم اور آپ جب مکتب کی تختی پر الف سے لے کر یا تک حرف اٹھائیس حروف لکھ کر اس درجہ پر پہنچ جاتے ہیں کہ اجمالی دنیا میں ان اٹھائیس حروف کے اندر دنیا بھر کے کل حالات اور قصے سمو لیتے ہیں اور دنیا کا کوئی اچھا یا بُرا تذکرہ ان سے جدا نہیں رہتا اسی طرح سے بلا تشبیہ و مثال خداوندِ عالم نے بھی لوحِ محفوظ میں ابتدائے آفرینش عالم سے لے کر اختتامِ عالم تک کل حالات و واقعات کو جو ہوئے یا ہونے والے ہیں اپنے کلکِ قدرت سے اس پر لکھ دیا ہے گویا الف معہٗ اپنی قیامت تک کی کل تفصیلات کے لوحِ دہر پر مرقوم ہے۔ اسی طرح بقیہ حروف کو بھی سمجھئے۔

پس جیسے ہمیں اور تمہیں قلم اور تختی کے بنانے میں کوئی دقت نہیں ہوتی اسی طرح سے خدائے بزرگ و برتر کو بھی لوح و قلم اور مادہ و روح کے پیدا کرنے میں کوئی ادنیٰ سا تامل نہیں ہوا۔ یاد رکھو روح ایک فرمان وارد ہے جو بوقت ارادہ و حکم خالق اس سے صادر ہو کر لباسِ حکم پہن کر شئے مطلوب سے متعلق ہو جاتا ہے اور جب اس کا تمام پورا ہو جاتا ہے اور اس کی غرض و غایت مکمل ہو جاتی ہے تو یہ حکم وارد شئے مطلوب سے کنارہ کشی اختیار کرتے ہوئے اپنی اصلی مرکز کی طرف لوٹ جاتا ہے۔ حکم الٰہی سے روح پیدا ہوتی ہے اسی لیے صادر ہونے کے اعتبار سے روح حادث ہے لیکن صفحۂ دہر پر ایک دفعہ مرقوم ہو جانے اور لکھے جانے کے بعد پھر حکم وارد کبھی نہ مٹ سکنے کی وجہ سے اَبدی و غیر فانی بھی ہے۔ مثال کے طور پر اس کو یوں سمجھئے کہ ایک ذی اقتدار فرمانروائے ملک کسی شخص کو مثلاً اپنے دربار میں بلا بھیجنے کا حکم صادر کرے حکم شاہی کے صادر ہونے پر خُدّام شاہی اس کو فوراً اپنے دل و دماغ میں لیتے ہوئے تعمیل حکم میں لگ جاتے ہیں اور یہ حکم شاہی باوجودیکہ ان کو آنکھوں سے نظر نہیں آتا مگر خُدّام شاہی کے دل و دماغ کو وہ حکم یقیناً اپنا اسیر اِس وقت تک بنائے رکھتا ہے جب تک پوری طرح سے اس کی تکمیل ہو کر وہ بصُورت مقصُود ان کو حاصل نہیں ہو جاتا البتہ حکم کی تعمیل ہو جانے پر پھر یہ حکم معہٗ اپنی مکمل تاریخ کے ایک واقعہ کی صُورت میں ہمیشہ کے لیے سرکاری دفتر میں محفوظ ہو جاتا ہے۔

بلا تشبیہ و مثال یہی صُورت امر رب و روح کی بھی ہے وہ بھی خلّاق عالم کے امر و حکم سے پیدا شدہ ایک نُور ہے جو تکمیلِ مقصد تک شکل و صُورت اختیار کیے رہتا ہے اور بعد تکمیل مقصد بے شکل و بے صُورت ہو کر پھر اپنے اصلی محور و مرکز

کی طرف لوٹ جاتا ہے۔

غور کیا جائے تو روح اور مادہ کی اس سے زیادہ حقیقت اور کچھ نہیں کر
ذاتِ واجب کا ایک پرتو، جلال و جمال و کمال ہے جو ہر مخلوق کی استعداد و قابل
کے مطابق اسے اپنی روشنی سے منور کرتا ہے اور عناصرِ اربعہ خدا کی صفت علم و حی
قیومیت و قدرت کا ایک فوٹو اور ان کی ایک جھلک ہیں ان سب کا وجود اسی
حقیقی اور وجودِ ازلی و ابدی کا ایک ظل اور آئینہ ہیں۔ جو ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ
گا۔ سچ یہ ہے کہ روح و مادہ اس کی پانچ شانوں کے مظاہر خاص ہیں اور اپنی ا
وابستگی خاص کی بنا پر ابدی و غیر فانی ہیں۔

روح انسانی کی دوسری ارواح پر برتری

تمام اروا
مذکورہ میں
روح انسانی جامع ترین روح تسلیم کی گئی ہے۔ روح کلی کے بعد اسی روح کا درج
ہے اور اگر یہ سعادتِ کبریٰ کی منزل پر پہنچ جائے تو روحِ کلی کا رنگ بھی اپنے اند
پیدا کر لیتی ہے۔ اسی طرح اگر جسمانی دنیا میں وہ نفسِ امارہ کی تابع فرمان ہو جائے تو
روح حیوانی سے بھی بدتر بن جاتی ہے۔ روح انسانی اگر دنیا سے پاک ہو کر جسم سے
نکلتی ہے تو عالم قدس اس کا ٹھکانہ ہوتا ہے جسے علیین کہتے ہیں اور اگر ناپاک ہو کر دنیا
سے رخصت ہوتی ہے تو عالم ظلمات اس کا ٹھکانہ ہوتا ہے۔ جسے سجین کہتے ہیں۔ ...
ہیں ارواح حیوانی سو وہ مکلف بالاحکام نہیں اسی لیے قابلِ مواخذہ بھی نہیں ہیں
یہ صرف ارواح انسانی کی خدمت کے خادم بنا کر دنیا میں بھیجی جاتی ہیں ان کی آمد و رفت
کا اس سے زیادہ کوئی مقصد نہیں ہے البتہ حلال و طیب مادوں سے ترکیب یافتہ

بہائم کو اگر خدا کے نام پر قربان کیا جائے تو ایسی شکل میں بے شک بہیمیت کی دلدل
میں پھنسی ہوئی روحیں بیدار و پاک ہو کر عالم کی صفِ اول میں جگہ پا لیتیں۔ ایسی قربان شدہ
روحیں قیامت میں ارواح انسانی کی سواریاں ہوں گی اور انہی اعلیٰ روحوں کے ساتھ
محسوب ہونگی۔

ابطال تناسخ

چونکہ روح انسانی مدبرِ امور ہے اور مدبر کے لیے اصولی طور
پر یہ ضروری ہوتا ہے کہ وہ حقائق کو پوری طرح سے پہچاننے
کے لیے ان کی اضداد کو بھی پہچانے۔ چنانچہ راحت کی اس وقت تک پوری طرح
سے قدر نہیں پہچانی جاتی۔ جب تک تکلیف سے سابقہ نہ پڑے اور روشن پہلوؤں کا
اس وقت تک پوری طرح سے احاطہ نہیں ہوتا جب تک تاریک پہلو بھی سامنے نہ آ
جائیں اس لیے روحِ انسانی ایک ہی دفعہ ہماری اضداد کی طرف متوجہ ہوتی ہے تاکہ اسی
مادہ سے بقا ملے اور ظہور سے خفا میسر آئے وہ باطن ہو کر ظاہر بنے اور اول ہو کر آخر
کہلائے اسی لیے اہلِ حق کا عقیدہ یہ ہے کہ روح کا تعلق اس بزم اضداد میں اپنے مادہ سے
بار بار نہیں ہوتا بلکہ صرف ایک ہی بار ہوتا ہے نہ مرنے کے بعد روح انسانی پھر دوسرے
بدن ہی میں جنم لیتی ہے۔ یہ عقیدۂ آواگون ہے کہ روح اپنے اعمال کی جزا و سزا میں مختلف
جسم پاتی ہے اور اس دنیا میں بار بار گدھے۔ گھوڑے۔ کتے۔ بندر۔ مکھی۔ مچھر۔ بلی۔ سور
وغیرہ کے روپ اختیار کرتی ہے۔ نیز مکتی اور نجات کے ہو جانے پر بھی اگر بہشت میں
کوئی برا عمل روح سے سرزد ہو جاتا ہے تو پھر اس کو دنیا میں کرم بھوگنے کے لیے واپس
بھیج دیا جاتا ہے۔ اسلام اس عقیدہ کو باطل قرار دیتا ہے اس کے نزدیک یہ دار العمل
ہے اور اس کے بعد جو عالم ہم پر کھلنے والا ہے وہ دار الجزا ہے یہاں خیر و شر ملے جلے

ہیں۔

عالمِ جزا میں خیر و شر کو دودھ اور پانی کی طرح سے علیحدہ کر دیا جائے گا اور
باعتبار اپنے اعمال خیر و شر کے جنت و دوزخ پر تقسیم ہو جائے گی۔ جنت خیر و
کا مرکز ہے اور جہنم شر و مصیبت کا مرکز ہے۔ اسلام اس عالم کو حادث مانتا ہے
لیئے اس کو اس نے دار العمل قرار دیا ہے آریہ مذہب اس کو قدیم مانتا ہے اس
اس کو دار العمل اور دار الجزا، دونوں تسلیم کرتا ہے۔

اگر روح کے مختلف جسموں کے پانے کی وَجہ محض اس کے اچھے، برُے اعمال
تو سوال یہ ہے کہ روحِ اوّل نے جب جسمِ اول اختیار کیا تھا تو اس کو کس عمل کی بنا
جسمِ اوّل مِلا تھا۔

بہر حال جس مرحلہ پہ جا کر بھی بات کرو گے ہمارا یہی سوال پھر بھی باقی رہے گا
المختصر کل مخلوق جزا و سزا پا کر دو حصوں پہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے بٹ جائے گی اور پھر
دونوں کے مِلنے کا کوئی امکان نہ ہوگا۔ کفار ہمیشہ جہنم میں رہیں گے اور ایماندار
بہشتوں میں ہر قسم کے آرام اٹھائیں گے۔

چونکہ ہمارا خدا مجبور محض نہیں کہ بُرے اعمال کا بدلہ برائی ہی سے دے ا
گنہگار اہلِ ایمان کی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور دیگر اولیاء کی شفاعت و سفار
سے بخشش بھی ہوگی اور یہ عفو و درگذر مختار مطلق کے سراسر شایانِ شان بھی ہے
کا دائرہ ایمان ہے لہذا مقابلینِ حق یعنی اہلِ کفر و شرک کی شفاعت کا اس روز
کوئی سوال ہی پیدا نہ ہوگا۔ ظالم بادشاہ کو بھی حضورؐ کی شفاعت نصیب نہ ہوگی جو
سے حضورؐ پر درود بھیجے یا جس کو حضورؐ کے مزار اقدس زیارت نصیب ہوا جو کہ

میں مرنے کی نیت سے رہے اور مر جائے ان کے لیے حضورؐ نے شفاعت کا وعدہ
فرمایا ہے۔

عرش و کرسی سدرۃ المنتہیٰ بیت المعمور وغیرہ

پانچواں اقرار ہمارے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ ہم آسمانوں اور زمینوں کی تعداد
سات مانیں جیسا کہ قرآن کریم کی آیت سبع سموات ومن الارض مثلهن
سے ظاہر ہے اور خدا کی بنائی ہوئی جنت و دوزخ اور اس کے پیدا کیے ہوئے عرش
و کرسی، لوح و قلم، بیت المعمور وغیرہ پر بھی دل سے ایمان لائے اور ان کا غیبی وجود
تسلیم کریں جو بوجہ اپنے علو شان اور لطافت و نورانیت اعلیٰ کے ہم کو اس جہانِ
کثیف میں نظر نہیں آسکتے۔

ہاں انبیاء علیہم السلام کی نگاہِ پاک ان کو ضرور دیکھنے کے قابل تھی۔ اہل اللہ بھی کشفی
حالت سے کسی قدر ان کا جائزہ لے سکتے ہیں۔ مگر قطعیت کے ساتھ نہیں اب ہر ایک عنوان
کی کچھ تشریح سنیے۔

عرش عظیم عرش عظیم خدائے علیم و خبیر کا تختِ جلال و جبروت ہے جس
کے آگے تمام جہانوں کی حکومتیں سرنگوں ہیں اور جس مقام اعلیٰ
وارفع سے کل جہانوں کے لیے احکامات صادر ہوتے ہیں۔ اس پر عظمت و جبروت
تختِ الٰہی کو اٹھانے والے آٹھ برگزیدہ و مقدس فرشتے ہیں جو اپنی بزرگی و برتری
کے لحاظ سے اپنا جواب نہیں رکھتے۔

عرش الٰہی معاذ اللہ دنیا کے تختوں کی طرح پر نہیں ہے جو کیلوں اور تختوں وغیرہ

سے جوڑا جاتا ہے اس کی صحیح کیفیت اور ہیئت وصورت کو تو اللہ اور اس کے مقدس فرشتے اور انبیاء علیہم السلام ہی جاننے والے ہیں۔ باقی جہاں تک ہمارے فکرِ نارسا نے کام کیا وہ یہ ہے کہ عرش عظیم حق تعالیٰ کی آٹھ برگزیدہ صفتوں کی یکجائی نورانیتوں کا ایک مظہر اور ان کی ایک نورانی شکل وصورت ہے جس پر نہ کوئی نگاہ ہی جم سکتی ہے نہ اس کی جلالت قدر کا کوئی اندازہ ہی کر سکتا ہے اس کا جسم اس کی وسعت جزوِ ایمان ہے لیکن اس کی کیفیت اور کمیت وضع اور حقیقت یہ ہمارے احاطۂ علمی سے باہر ہے۔

عرشِ عظیم اس معنی سے کہ خدا نے اسے بنایا ہے اور اپنی آٹھ صفتوں کا مظہرِ خصوصی ٹھہرایا ہے مخلوق وحادث ہے اور اس معنی سے کہ وہ خدائے غیر محدود کا تخت جلال وجمال وکمال ہے غیر متناہی اور محیط کل اجسام بھی ہے۔ نیز ابدی بھی ہے۔

رہا یہ کہ وہ آٹھ صفتیں جو عمودِ عرش ہیں اور کل جہانوں کو اپنا جمال جہاں آرا دکھلاتی ہیں ان کے نام کیا ہیں۔ سو اس سلسلہ میں جہاں تک ہمارے فکرِ نارسا نے تتبع واستقراء سے کام لیا اسے یہی معلوم ہوا کہ وہ آٹھ صفتیں یہ ہیں :-

اللہ لا الٰہ الا ھو رب العرش العظیم

الملک : حکومت وفرمانروائی کرنیوالا	القدوس : ہر عیب ونقصان سے پاک رہنے والا
السّلام : ازلی وابدی سلامتی رکھنے والا	مومن : ایمان کی عطا کرنیوالا ، امن دینے والا
المھیمن : جملہ مخلوقات کی نگہبانی فرمانیوالا	العزیز : ازلی وابدی غلبہ رکھنے والا
الجبّار : جبر فرمانیوالا	المتکبر : بڑائی میں مخمور اور اس سے کبھی جدا نہ ہونیوالا

باقی یہ ہمارا ایک تخمینہ ہے ہو سکتا ہے کہ کوئی اور صورت ہو۔ عقیدہ تو صرف اسی حد تک ہے کہ عرش عظیم حق تعالیٰ کا ایک تختِ جلال وجبروت ہے جس کو اس نے بنایا ہے جو بحیثیت ایک نورانی مخلوق ہونے کے حادث ہے۔ البتہ بلاواسطہ ذاتِ باری تعالیٰ سے ایک خاص اور عظیم نسبت رکھنے کے ابدی بھی ہے۔

کرسی کرسی عرش سے نیچے ہے اس کا وجود ظہورِ عرش کے بعد ہوا ہے یہ بھی عرش کی طرح سے مخلوق وحادث ہے مگر ساتھ ہی ابدی بھی ہے۔

خدا کی کرسیِ قدرت بھی معاذ اللہ ہماری کرسیوں کی طرح سے نہیں ہے اسی کی حقیقی شکل وصورت کو تو اللہ اور اس کے مقربینِ خاص ہی جانتے ہیں۔ باقی جہاں تک ہم نے اس کی حقیقت کا کھوج لگایا ہے ہمیں تو یہی نظر آیا کہ مقام کرسی میں بھی حق تعالیٰ کے چار برگزیدہ وبرتر صفتوں کے انوار وبرکات یکجا مجتمع ہیں وہ صفتیں یہ ہیں :-

علم ، حیات ، قیومیت ، قدرت ، جیسا کہ آیت الکرسی لا الٰہ الا ھو الحی القیوم الخ میں حی وقیوم اور یعلم ما بین ایدیھم اور وسع کرسیہ السّموات کے اشاروں سے خدا کی مذکورہ بالا چار صفتوں کا تعین قرینِ قیاس نظر آتا ہے۔ یہی صفتیں عناصرِ اربعہ کی مربی ہیں۔

کرسی کو کرسی اس بنا پر کہتے ہیں کہ اس کے چاروں پائے ایک دوسرے سے متصل اور مقرون وموزوں ہوتے ہیں اور مل کر وزن اٹھاتے ہیں۔ اللہ کی ان چار برگزیدہ صفتوں کے انوار وبرکات نے بھی تمام جہانوں کے علم وقدرت حیات وقیام عطا ہوئے ان کو تھام رکھا ہے غور سے دیکھا جائے تو انہی صفاتِ اربعہ کی جمع وترتیت سے عناصرِ اربعہ کی جمع وترتیت وابستہ ہے اور وہ عالمِ اجسام میں ایک دوسرے سے ملے

ہوئے ہیں جس وقت بھی کرسی کی یہ چار صفتیں اور عرش عظیم پر مجتمع آٹھ صفتیں جو مل کر بارہ ہوتی ہیں اور بارہ برجوں میں اپنے انوار و برکات کو نمایاں فرماتی ہیں مرتبہ ظہور جمعیت سے باپیمانے واجب تعالیٰ کنارہ کشی اختیار فرمالیں گی ۔ معاً کارخانۂ عناصر درہم و برہم ہو کر رہ جائے گا ۔

سدرۃ المنتہیٰ

سدرۃ المنتہیٰ کرسی سے نازل مرتبہ ہے جو کرسی سے نیچے واقع ہے ۔ یہ مقام نور ملائکہ کی سیر علمی و عملی کا منتہیٰ ہے ۔ یہاں بیری کے درخت کے مشابہ ایک نور کا درخت ہے جہاں سے کل ارواح سعیدہ کو قرار و سکینت اور اطمینان و راحت و سرور و بہجت کی نعمتیں عطا ہوتی ہیں ۔ جیسے صاف شفاف پانی میں غسل کرنے سے انسان کو ایک قسم کا کیف و سرور حاصل ہوا کرتا ہے بلاتشبیہ اس سے کہیں زیادہ لطف و سرور اہلِ سعادت کو یہاں سے مرحمت ہوتا ہے اس نورانی درخت کی ہر سمت ہر وقت مقرب فرشتوں کا جھمگٹ لگا رہتا ہے اگر اس نورانی جگہ کے لیے فرشتوں کو پروانۂ انوار اور جگنوئے علم سے تعبیر کیا جائے تو شاید اس نورانی جگہ کا کسی قدر فوٹو عالم الفاظ و بیان میں لایا جاسکے ۔

بیتُ المعمُور

کرسی کے نیچے فرشتوں کا ایک قبلہ ہے جو آسمانوں میں واقع ہے ۔ اس قبلہ کا نام بیت المعمُور ہے ۔ اس آسمانی قبلہ پر عرش و کرسی سے ہر آن انوار و برکات بارش کی طرح سے برستے رہتے ہیں اور بے شمار فرشتے ہر آن اس کے ارد گرد طواف کرتے ہیں اور پروانوں کی طرح سے اس پر نثار ہوتے ہیں ۔

بیتُ اللہ

اس طرح سے سرزمین حجاز میں اہل زمین کے لیے ایک قبلہ بنایا گیا ہے جس کو بیت اللہ کہتے ہیں چنانچہ اس کی طرف منہ کر کے عالم کے ہر خطہ کا رہنے والا مسلمان نمازیں پڑھتا ہے اور جس کا طواف ہر آن جاری رہتا ہے اس زمینی قبلہ پر بھی عرش و کرسی کے انوار و برکات کی اس طرح سے بارشیں برستی ہیں جس طرح سے بیت المعمور پر ذکر کی جاچکی ہیں ۔ یہ دونوں قبلہ عرش و کرسی کے نیچے واقع ہیں اور اتنے سیدھ میں واقع ہیں کہ مثلاً اگر کوئی چیز وہاں سے سیدھی چلے گی تو سیدھی قبلہ عالم پر آکر ٹھہرے گی قبلہ ارضی ہی سے فی الحقیقت اس عالم کا قیام وابستہ ہے جب ظہور قیامت کا وقت قریب آپہنچے گا تو یہ قبلہ منہدم ہو جائے گا اور جو تجلیاتِ الٰہی اس پر نازل ہیں وہ اٹھالی جائیں گی ۔

جنّت و دوزخ

جنت عالمِ عقبیٰ کا دارالخیر و دارالسرور ہے جو قابلِ مغفرت بندوں کا مسکن ہے اور دوزخ دارالشر و دارالحزن ہے جو ناقابلِ مغفرت بندوں کا ٹھکانہ ہے ۔ ہر نیکی یہاں جنت کا ایک دروازہ ہے اور ہر بدی جہنم کا دھانہ ۔ جو راحت یہاں نیکی میں انسان محسوس کرتا ہے اور جو مصیبت اور کلفت یہاں وہ بدی میں دیکھتا ہے ۔ عالمِ عقبیٰ و دارِ آخرت میں یہ سب امور ایک شکل و صورت کے مالک ہونگے ۔ جنت ہر قسم کی نیکیوں کی ایک پر حلاوت وجودی تصویر ہے اور جہنم ہر قسم کی برائیوں کی ایک مصیبت دہ عملی شکل ہے خیر کا مرکز جنت ہے اور شر کا مرکز جہنم ہے ۔ عالمِ عقبیٰ میں پہنچ کر ہر ذی شعور مخلوق بلحاظ اپنے اعمال خیر و شر کے دو قسموں پر بٹ جائے گی ۔ اہلِ ایمان جنت میں جائیں گے اور اہلِ کفر جہنم میں ۔ جنت و دوزخ مخلوق و حادث ہے مگر اس کے ساتھ ابدی بھی ہیں ۔ ان

کو اس عالم میں بوجہ نگاہ کثیف کوئی نہیں دیکھ سکتا۔ البتہ نگاہِ کشفی سے کسی قدر ادراک ممکن ہے۔ جنت میں انسان کی کوئی آرزو ایسی نہ ہوگی جو پوری نہ کی جائے گی۔ جنت میں برائی کا تصور تک نہ آسکے گا۔ جنت کے رہنے والے چاند سورج سے زیادہ روشن ہوں گے اور جہنم کے مستحق کالے توے سے زیادہ تیرہ وتاریک ہونگے جنت کی تمام نعمتوں سے بڑھ کر نعمت دیدار الٰہی ہے جس کے آگے تمام نعمتیں ہیچ نظر آئیں گی۔

غرض جنت کی تمام نعمتیں اور جہنم کی تمام زحمتیں غیر فانی اور بے قیاس ہیں۔ اس عالم میں ان کی کیفیت وکمیت کا کوئی اندازہ نہیں ہوسکتا۔

میزان وپلصراط

قرآن وحدیث کی شہادت ہے کہ یوم حساب میں انسان کی تمام چھوٹی بڑی نیکیاں اور برائیاں تولی جائیں گی۔ اور میزانِ عدل میں ان کی نورانیت وظلمت کا موازنہ کیا جاوے گا۔ لیکن ان کا وزن باعتبار عقیدہ ونیت ہوگا۔ جس قدر جس کی نیت پاک اور پختہ ہوگی اتنی ہی اس کی نیکیاں وزن دار ہوں گی۔ اسی طرح برائیوں کو قیاس کیجئے۔

حدیث میں ہے ایک شخص کی ننانوے برائیاں ہونگی اور صرف ایک نیکی ہوگی ایسا شخص بارگاہِ ایزدی میں عرض کرے گا۔ بارِ الٰہا! میری ایک نیکی میری اتنی برائیوں کے مقابلہ میں کیا حقیقت لیے ہوئے ہے جب میں دوزخ ہی کے لائق ہوں تو بغیر وزن اعمال مجھ کو جہنم میں بھیج دیا جائے اس وقت ارشادِ باری تعالیٰ ہوگا ہم ظالم نہیں ہیں یہ نیکی ضرور تولی جائے گی۔ چنانچہ وہ برائیوں کے مقابلہ میں تولی جائے گی۔ تو نیکی کا پلہ جھک جائے گا اور وہ شخص مستحق جنت قرار پائے گا۔ ہر امت کا محاسبہ اور اس کے

اعمال کا وزن اس قوم کے نبی کی ہدایات وتعلیمات کے مطابق ہوگا۔ اسی لیے ہر ایک امت کی میزانیں بھی جدا ہی جدا ہونگی کما اشار الیہ تعالیٰ ونضع الموازین القسط قِسط کے معنی خیر وشر کو عدل وانصاف سے علیحدہ کرتے ہوئے دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی کردینا ہے۔ میزانِ اعمال سے یہی کام لیا جاوے گا۔

دوزخ کے اوپر ایک پلصراط ہے جو بال سے باریک اور تلوار سے زیادہ تیز ہے اس کے آخری سرے پر جنت واقع ہے۔ یوم حساب میں ہر ایک نیک وبد کو حکم ہوگا کہ وہ اس پر سے ہوکر جنت میں جائے اس کی مسافت پندرہ ہزار میل تبلائی گئی ہے چنانچہ جن کے اعمال جس قدر زیادہ بہتر ہونگے اسی قدر ان کی رفتار تیز ہوگی کوئی بجلی کی طرح سے کوند کر اس مسافت کو طے کرے گا کوئی اونٹ گھوڑے جیسی رفتار سے اس مسافت کو ختم کرے گا۔ کوئی بڑی مشکل سے گرتا پڑتا اس پر سے گزرے گا۔

غرض جیسے جس کے اعمال ہونگے ویسے ہی اس کی رفتار ہوگی جو منافق اور اہل کفر ہونگے وہ اس دھار سے زخمی ہوکر جہنم میں جا پڑیں گے پلصراط کے وجود کی حقائیت کا دنیا میں بھی مشاہدہ کیا جاسکتا ہے یہاں بھی اعتدال کا راستہ جو افراط وتفریط سے خالی ہو اتنا ہی مشکل اور اتنا ہی خفی ہے۔ کہ اس کو بڑی مشکل ہی سے ڈھونڈا جاسکتا ہے ہر شعبہ زندگی میں میانہ روی کی راہ اختیار کرلینا کوئی آسان کام نہیں ایک معتدل روش کے مالک کو ہر آن اسی قدر ہوشیار اور خوفزدہ رہنا پڑتا ہے جس قدر کہ پلصراط پہ چلنے والوں کو قیامت میں چوکنا رہنا ہوگا۔ غور سے دیکھا جائے تو یہ پلصراط وہی صراط اعتدال ہے جو قیامت کے روز مذکورہ بالا شکل وصورت کے ساتھ ہر ایک کو دکھائی دے گی۔

جبر و قدر

چھٹا اقرار ہمارے لیے بحیثیت ایک مسلمان کے یہ بھی
ہے کہ ہم اپنے افعال میں نہ مجبور محض بنائے گئے ہیں
مختار مطلق۔ ہمارے لیے نہ مطلق جبر کو قدرت کی طرف سے روا رکھا گیا ہے نہ ہمیں
اختیار ہی دیا گیا ہے اگر ہمیں قدرت کی طرف سے مجبورِ محض بنایا جاتا ارادہ و اختیار اور
شعور سے بالکل نہ نوازا جاتا اور پھر ہم سے محاسبۂ اعمال ہوتا تو یہ ظلم ہوتا اور اگر ہمارے حق کی
طرف سے ارادہ و اختیارِ کامل دیدیا جاتا تو پھر انسان مخلوق کے بجائے خالق بن جاتا
اس لیے افعالِ انسانی میں کچھ اس کو اختیار اور کچھ جبر کا دیا جانا خدا کے عدل و انصاف
کے عین مطابق تھا عقلِ سلیم کی گواہی بھی یہی ہے کہ نائب کو منیب کی طرف سے اتنا ہی
اختیار دیا جانا بھی چاہیئے تھا کہ خلیفۂ کائنات نہ بالکل مجبور ہو اور نہ خدا کی طرح سے مختار
کُل ہو۔

موت و حیات

ساتواں اقرار ہمارے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ ہم نفع و
ضرر موت و حیات کا مالک خدا کو جانیں اور موت و
حیات کو اسی کے یدِ قدرت کا نتیجہ تصور کرتے ہوئے ان دونوں کو مخلوق سمجھیں۔ حیات
تین قسم پر ہے :-

حیاتِ اول جو ماں کے پیٹ سے شروع ہو کر نزعِ روح کے وقت موت پر ختم
ہو جاتی ہے۔

حیاتِ دوم جو قبر سے لے کر قیامت تک حاصل ہوتی ہے یہ حیاتِ برزخ کہلاتی
ہے۔ حیاتِ برزخی میں روح انسانی کچھ مدت کے لیے اپنے جسم میں منکر نکیر کے سوالات
کے جوابات دینے کے لیے داخل ہوتی ہے مگر دوامی طور پر نہیں۔ قبر کا یہ نطق بے آواز

ہوتا ہے اور اس کی سماعت بھی حیاتِ اول کی سماعت سے مختلف ہوتی ہے۔ حیاتِ
برزخی میں روح انسانی جنت و جہنم سے الگ رہ کر کامل جزا و سزا تو نہیں پاتی۔ لیکن
عذابِ قبر یا ثوابِ جنت سے اس کو ضرور سابقہ پڑتا ہے گویا یوں سمجھنا چاہیئے کہ یہ اُخروی
جزا و سزا کی ایک جھلک ہوتی ہے۔

حیاتِ سوم حیات اُخروی ہے۔ حیاتِ اخروی کی ابتدا قیامت سے ہوتی ہے
اور اختتام اس کا کہیں نہیں ہوتا کیونکہ یہ تیسری حیات اَبدی ہوتی ہے اسی طرح سے
موت بھی تین قسم پر ہے۔

پہلی موت عدم وُہ ہے جب روحِ انسانی پہ دنیا میں آنے سے پہلے پردۂ عدم
پڑا ہوا رہتا ہے جس کے بعد حق تعالیٰ اس کو عالم عناصر میں لاکر زندہ فرماتا ہے۔

دوسری موت وہ ہے جو جسم کو روح سے علیحدہ کرتے وقت جسم انسانی پہ واقع ہوتی
ہے۔

تیسری موت وہ ہے جب نفخِ صُور سے کل عالم کی موت واقع ہو گی اور جب یہ دعویٰ
وغیرہ سب کو کچھ عرصہ کے لیے فنائیت یا غشی کامل کا مرتبہ اختیار کرنا پڑے گا جس کے
بعد یکہ و تنہا رہ کر حق تعالیٰ فرمائیں گے لمن الملك اليوم آج کی سلطنت کس کے
لیے ہے چونکہ اس وقت کوئی موجود نہ ہو گا اس لیے حق تعالیٰ خود ہی جواب فرمائیں
گے لله الواحد القهار ط سلطنت خدائے واحد القہار کے لیے ہی سزاوار ہے۔

انسان اور اُس کا مقصدِ خلقت

مذکورہ بالا غیبی امور پہ
ایمان لانے کے بعد
آٹھواں اقرار ہمارے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ ہم میں سے ہر ایک انسان اپنے کو خدا کے

آگے جواب دِہ سمجھے اور مکلّف بالاحکام جانے خدا کی اطاعت مخلوق کی خدمت اور اپنے پالنہار کی چوکھٹ پر سجدہ ریزی کو اپنا آخری مقصدِ حیات تصور کرے یہ اس لیے ہم پر واجب ہے کہ حق تعالیٰ نے ہم کو شعورِ اعلیٰ سے نوازا۔ اور ہمیں نیابتِ الٰہیہ کا خلعتِ فاخرہ پہنا کر باعتبارِ خلقت جملہ مخلوق سے افضل و اعلیٰ قرار دیا۔ ساری کائنات کو ہمارے لیے مسخر کیا اور ہمیں اپنے کرم سے کسی ایسی تکلیف کا حکم نہ دیا جو ہماری قدرت سے باہر ہو اور ہماری رہنمائی کے لیے ہمارے واسطے ایسا جامع قانون بھیجا کہ جس پر عمل کرنے سے ہمیں دونوں جہاں میں عزت و سربلندی اور قدرت و کرامت و آسانی میسّر آئے۔

پھر جب کہ ہم اپنے افعال میں بھی مختار بنائے گئے ہیں چنانچہ ہم میں سے ہر ایک کو اپنے احاطہ اختیار میں ہر قسم کے بُرے بھلے کام کرنے کا حق ہے۔ ہاں ہم مطلق العنان بھی نہیں بنائے گئے ہیں کہ جو جی میں آئے وہ کر گزریں بلکہ ہم خالقِ کائنات کے آگے جواب دِہ بھی ہیں۔ ایسی صورت میں بدرجہ اولیٰ ہمارے لیے اطاعتِ حق ضروری اور لازمی ٹھہر جاتی ہے۔ ہر سچے اطاعت گزار نائب کا قدرتی طور پر یہ فریضہ ہے کہ وہ اپنے منیب اور مخدوم و مرجع الامر کی اطاعت و خوشنودی و رضامندی حاصل کرنے کی فکر میں شبانہ روز لگا رہے اور اسی کو اپنا مقصدِ حیات ٹھہرائے۔ شر کی راہوں سے دور ہو اور خیر کی راہوں کو اپنائے۔

حکیم مطلق کا کوئی فعل حکمت سے خالی نہیں ہوتا

چونکہ حکیم مطلق کا کوئی فعل حکمت سے خالی نہیں ہوتا اس لیے ہر مخلوق کے

وجود سے کسی نہ کسی حکمت کا ظہور یقینی ہے۔ سانپ اور بچھو بظاہر مضر نظر آتے ہیں لیکن اگر بحیثیت مجموعہ عالم ان کے وجود پر غور کیا جائے تو سینکڑوں زہریلے اثرات کو یہ زہریلی مخلوق اپنے اندر جذب کر کے فضا کو صاف بنا کر بے شمار منافع سے انسان کو مستفید بھی کرتی ہے جیسا کہ حکمائے عالم کا اس پہ اتفاق ہے۔

پھر جب کہ چاند، سورج، ستارے، شجر و حجر، ابر و باد سب کے سب انسان کی اجتماعی و انفرادی ضروریات کے اہتمام و انصرام میں اپنے کو وقف کیے ہوئے ہیں اور یہ سب چیزیں انسان کے لیے کارآمد ہیں مگر انسان ان میں سے کسی ایک کے بھی کام کا نظر نہیں آتا تو اس کے بعد ماننا پڑے گا کہ یہ امیر کائنات اور نائبِ الٰہی یقیناً خدا کا کلمہ زمین پر بلند کرنے اور احکام الٰہی کی تعمیل کرنے اور دوسروں سے کرانے کے لیے آیا ہے اور انسان کے دنیا میں بھیجے جانے سے یقیناً ایک مقصدِ الٰہی ہے جس کو پورا کرنا اس کا اصلی کام ہے۔ پھر جب کہ اس کو نورِ عقل بھی مرحمت فرمایا گیا ہے تو اس کے بعد تو یہ حقیقت روزِ روشن کی طرح سے جلوہ گر ہو کر سامنے آجاتی ہے کہ اس امیر کائنات کے دنیا میں بھیجے جانے سے مقصدِ الٰہی یہ ہے کہ وہ اپنی خداداد عقل کے ذریعہ سے ہر چیز کے مقصدِ خلقت کو سمجھ کر اسے اپنے اور کل بنی نوعِ انسان کے لیے بہتر سے بہتر اور مفید تر بنائے علمِ کائنات سے خدا کے علمِ بے پایاں کی قدر پہچانے تو دنیا میں عزت و سرمایہ و اقتدار حاصل کر کے اس کی عظمت و کبریائی اور قدرتِ واسعہ کی برتری کی گواہی دے اور اپنے علم و قدرت کو خدا کے تابع فرمان رکھے۔

انسان کی مختلف جہتوں سے متعدد قسمیں ہیں مثلاً

انسان کی قسمیں

نیکی اور بدی کے لحاظ سے انسان دنیا میں دو قسم کے

شمار ہوتے ہیں ۔ ایک نیک دوسرے بد ۔ پھر غربت و امارت کے اعتبار سے بھی
کی دو قسمیں ہیں ایک وہ جن کو اس دنیا میں قدرت و برکت سے حصّہ وافر ملا
دوسرے وہ جن کو اس دنیا میں نپی تلی روزی دی گئی ہے ۔ عقل کے لحاظ سے بھی
قسمیں ہیں ۔ ایک عقلمند دوسرے بے وقوف ۔ اصل یہ ہے کہ انسان کی عظمت
اہمیت محض اس کی عقل اور اس کے کیریکٹر اور تقویٰ و پرہیز گاری خدمتِ خلق
شرافتِ ذاتی پر مبنی ہے محض مال وجہ شرافت و کرامت نہیں ہے ۔

مدار فیصلہ عقل بشر نہیں ہو سکتی

چونکہ انسانوں کی عقلیں باہم متفاوت ہیں اور قدرتی طور پر جو نتائج و اثرات
میں مختلف واقعات سے انسان اخذ کرتا ہے وہ بھی مختلف ہوتے ہیں اس لیے اُن
طور پر اس سلسلہ میں یہ کلیہ بھی یقیناً واجب التسلیم ہو گا کہ انسانی افعال و کردار میں ح
و قبح کا معیار خود عقل انسانی نہیں ہو سکتی بلکہ افعالِ لبشر میں حسن و قبح کا معیار فیصل
ہے یہ نظریہ اس لیے واجب التسلیم ہے کہ علمِ لبشر نہ تو ریب اور شک سے خالی ہو سک
نہ عقلِ لبشر سے خطا و نسیان ہی جدا ہو سکتے ہیں ۔

قانونِ الٰہی اور انبیاء کی بعثت کی ضرورت

اس صورتِ حال کے بعد کہ ہمارا علم شک اور تردد سے خالی نہیں اور ہماری
کی رسائی حواس ظاہری سے آگے نہیں اور خدا ہمیں ان آنکھوں سے اس مادی دنیا
دکھلائی نہیں دے سکتا جس کی وجہ یہ ہے کہ بندہ میں اور خدا میں کوئی اشتراک نہیں د

غنی ہے توہم فقیر و محتاج ہیں وہ غیر محدود ہے توہم حرص و ہوا میں گرفتار اور چار سمتوں
میں محدود و محصور ہیں وہ باقی ہے توہم فانی ہیں وہ قدیم بالذات ہے توہم حادث بالغیر
ہیں وہ واجب ہے توہم ممکن ہیں وہ مالک ہے توہم مملوک ہیں ۔

اُصولاً ہمارے لیے یہ تسلیم کرنا ناگزیر ہے کہ بندہ کو خدا کی مرضیات کا علم حاصل کرنے
کے لیے ایک ایسے مکمل غیر متغیر لاء کی یقیناً ضرورت تھی جو خیر و شر کے راستوں کو نکھار
کر سامنے رکھ دے اور جو اپنی غیر متزلزل تعلیمات و ہدایات کے لحاظ سے سورج کی
طرح نہ گھٹ سکے اور نہ بڑھ سکے اور اپنے محکم اُصول اور کلیات کی رو سے قیامت
تک کل اقوامِ عالم کے لیے یکساں موجبِ ہدایت و رہنمائی کا ل ہو اور عالم کے یوم آخر
تک وہی کل اختلاف نوع انسانی کے لیے ایک حَکم اور ثالث کی حیثیت رکھے ۔

عقل و مشاہدہ نجات کیلئے کافی نہیں :-

اس لیے نواں عقیدہ و اقرار ہمارے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ ہم بسلسلہ عبادات
و معاملات و اقتصادیات و عمرانیات و سیاسیات وغیرہ عقل و مشاہدہ کو مدارِ نجات
نہ سمجھیں بلکہ کل انبیاء علیہم السلام کے شعور و ادراک کو اور خدا کی مرسلہ وحی آخر کو جس کے
مجموعہ کا نام قرآنِ عزیز ہے اسی کو مدار فکر و نجات تصور کریں اور جس قدر انبیاء علیہم السلام
کی تعلیمات سابقہ ہیں ان پر اجمالی لائیں اور اپنی عقل کو صرف خیر و شر کا اور اچھائی اور برائی
کا ایک دریافت کنندہ و سراغ رساں جانیں ۔ نیز آدم علیہ السلام سے لے کر حضرت محمد
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک جس قدر بھی قدسی صفت معصوم النفس انبیاء و رسول
وقتاً فوقتاً مختلف قوموں کی ہدایت کے لیے دنیا میں آئے اور رسولِ آخر کی پیشین

گوئیاں کرتے ہوئے وحیِ آخر کی ضرورت پر گواہ بنتے رہے ان سب پر بلا
ایمان لائیں جن کی صحیح تعداد کا علم حق تعالیٰ ہی کو ہے اور سلسلۂ نبوت کو تکمیل وحی کی
اہم ضرورت سمجھ کر جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر اس سلسلہ کو مکمل اور مختتم

قرآن کریم کی حفاظت :-

یہ ایک ناقابلِ انکار حقیقت ہے کہ خدا نے امتِ محمدیہ کو تمام امتوں پر ایک امتیا شرف بخشا ہے خدا نے آخری نبی کو آخری کتاب اور آخری وحی دے کر وہ بزرگی عطا ہے کہ ان کے بعد نہ نبوت کی ضرورت ہی باقی رہتی ہے اور نہ کسی نبی اور الہامی کتاب کی۔ قرآن مجید وہ محفوظ آخری وحی ہے جس کی حفاظت کا ذمہ خود خداوند عالم نے اپنے اوپر لیا ہے۔ چنانچہ دیکھ لو کہ وحی آخر آج لاکھوں کروڑوں سینوں میں نسلاً بعد نسل و قرناً بعد قرن تیرھویں صدی میں بھی اسی طرح محفوظ چلی آرہی ہے جس طرح پہلے تھی۔ کُتبِ سابقہ کی طرح سے نہ اس میں کوئی تحریف و تغیر ہی ہوسکتا ہے نہ اس میں کمی زیادتی ہی ممکن ہے جو تیرہ سو برس پہلے قرآن تھا وہی آج بھی لاکھوں سینوں اور کروڑوں کاغذی صفحات میں محفوظ ہے ممکن نہیں کہ اس میں ایک شوشہ کا بھی فرق آسکے اور اگر آئے تو وہ گرفت سے بچ جائے۔ وحی آخر یعنی قرآن مجید کل کتبِ سماویہ کا لب لباب اور مستند خلاصہ جامع ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سب انبیا کی اساس ادسان کے ملجا و ماویٰ ہیں اسی لیے قرآن کریم پر ایمان لانا کل انبیاء کی تعلیمات پر ایمان لانے کے ہم معنی ہے اور پیغمبر آخر کا حلقہ بگوش ہونا کل انبیاء کا حلقہ بگوش ہونا ہے۔

انبیاء و رُسل کی قسمیں اور ان کی تعداد :-

انبیاء کی تعداد ایک لاکھ چوبیس ہزار بیان کی گئی ہے۔ بعض روایتوں میں دو لاکھ چوبیس ہزار ہے لیکن قولِ راجح یہی ہے کہ انبیاء و رسل کی صحیح تعداد کو حق تعالیٰ ہی بہتر جاننے والے ہیں۔

انبیاء علیہم السلام دو طرح کے تھے ایک وہ جن کو کوئی آسمانی کتاب اور صحیفہ دیا گیا۔ دوسرے وہ جن کو کوئی صحیفہ یا کتاب نہیں دی گئی بلکہ پچھلی کتابوں ہی کی پیروی کا حکم دیا گیا جن کو کوئی کتاب دی گئی ان کو نبی و رسول کہا جاتا ہے اور جن پر محض وحی نازل ہوئی ان کو نبی کہا جاتا ہے پس نبی و رسول میں عام و خاص کی نسبت ہے ہر ایک رسول کا نبی ہونا ضروری ہے۔ لیکن ہر نبی کا رسول ہونا ضروری نہیں ہے۔

آسمانی کتابوں کی تفصیل :-

آسمانی صحیفے اور کتابیں جو آدم علیہ السلام سے لے کر جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک انبیاء و رُسل پر نازل ہوئے ان کی تعداد ایک سو چار تبلائی گئی ہے دس صحیفے حضرت آدم علیہ السلام پر نازل ہوئے تھے اور پچاس صحیفے شیث علیہ السلام پر تیس حضرت ادریسؑ پر نازل ہوئے اور دس حضرت ابراہیم علیہ السلام پر اور چار کتابیں توراۃ و انجیل و زبور و قرآن چار انبیاء علیہم السلام پر نازل ہوئیں۔ توراۃ حضرت موسیٰ پر انجیل حضرت عیسیٰ پر۔ زبور حضرت داؤد پر۔ قرآن نبیِ آخر محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم پر صحیح تعداد اللہ ہی جاننے والا ہے کہ کل کس قدر کتابیں اور

صحیفے دنیا میں نازل ہوئے۔ باقی مصدقہ قرآن پانچ کتابیں ہیں یعنی صحیفہ ہائے ابر
اور چاروں مذکورہ بالا الہامی کتابیں ممکن ہے ان کے علاوہ بھی کوئی آسمانی کتا
اور صحیفہ حضور سے پہلے کسی نبی پر اترا ہو اور ہندوستان میں بھی کوئی نبی مبعوث کیا
ہو۔

بہرحال ہمارا اجمالی ایمان یہ ضرور رہنا چاہیئے کہ ہر قوم کے اندر خدا نے نبی
رسول بھیجے اور ہر قوم کے حسب حال ان کو آسمانی ہدایتیں پہنچیں جن سب کے
میں سردارِ دوجہاں نبی آخر صلی اللہ علیہ وسلم کو کل اقوامِ عالم کا قیامت تک عالم گیر
رسول بنا کر مبعوث کیا گیا اور ان کے اوپر ایک جامع کتابِ الٰہی یعنی قرآن کو نازل
کر دین حق کو کامل کیا گیا۔ رہ گئیں کتب سابقہ سو انبیاء سابقین کے پیروؤں نے
آپس کے اختلاف کی وجہ سے اصل نسخہ تورات و انجیل وغیرہ کو جلا پھونک کر ہمیشہ
کے لیے گم کر دیا ہے۔ اب جو تورات و انجیل وغیرہ پائی جاتی ہیں یہ سب انبیاء کے
تبعین نے بعد کو اپنی یاد سے مرتب کی ہیں۔ پھر ان میں بھی مزید تحریف و تغیر تاریخی شہادت
سے ثابت ہے اس لیے اب مدار ایمان صرف قرآن اور نبی آخر ہی ہیں۔

باقی جو تعداد صحیفہ ہائے الٰہیہ کی مذکور ہوئی ہے اس کے متعلق ہمارا تخمینہ یہ
ممکن ہے وہ صحیح ہو اور ممکن ہے وہ غلط ہو کہ دس صحیفے جو آدم علیہ السلام پر نازل کیے
گئے تھے وہ علاوہ ہدایت و ارشاد کے زراعت کے اصول اور کلیات پر مشتمل تھے گو
وہ زراعت کے دس کورس تھے جن کی تعلیم ابنائے آدم کو حق تعالیٰ کی طرف سے دی
گئی تھی جس کی ترقی یافتہ صورتیں آج سامنے آ رہی ہیں اور پچاس صحیفے حضرت شیث
پر علاوہ تعلیمات حکمت پر مشتمل ہونے کے صنعت و حرفت کے لیے نازل کیے گئے

تھے گویا صنعت و حرفت کے یا پچاس کورس تھے جن میں پچاس قسم کے صنائع سے
کو خبردار کیا گیا جس کی ترقی یافتہ شکلیں آج عالم میں نمودار ہیں۔
اور تیس صحیفے حضرت ادریسؑ کو نجاری وغیرہ پر مشتمل عطا کیے گئے تھے جن کا ظہور
ترقی یافتہ شکل میں آج ہو رہا ہے۔ یہ تیس کورس گویا محنت و اُجرت کے تھے اور
حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دس صحیفوں میں سائنس اور علوم سماوی کے اصول بتلائے
گئے تھے چنانچہ انبیاء سابقین کا مختلف کاروبار کرنا اور اقتصادی حالت کو سنوار کر
مذہبی حالت کو درست کرنا مثلاً داؤد علیہ السلام کا لوہے اور پیتل کو گلا کر ان سے
اور زرہ بنانا ایوب علیہ السلام کا کھیتی باڑی سے اقتصادی معراج و ترقی پر پہنچنا
ادریس علیہ السلام کا نجاری کے فن میں کمال پیدا کر کے کمال کی راہ سے خدائے با
کمال کی طرف مخلوق کو متوجہ کرنا۔ حضرت ابراہیم کا علومِ سماویہ میں بصیرت پیدا کر کے
توحیدِ باری تعالیٰ پر ایمان لانا خود ہمارے رسول آخر صلی اللہ علیہ وسلم کا ملک شام
تشریف لے جا کر تجارت فرمانا اور مسلمانوں کو اقتصادی لائن میں بین الاقوامی و بین
الممالکی تجارت کا سبق دے کر دنیا میں سربلندی کا راستہ بتلانا بتلا رہا ہے کہ مسلمانوں کو
اس کے رسول نے رہبان اور تارکِ دنیا نہیں بنایا ہے بلکہ ہر سلسلۂ حیات میں اس
کا سب سے اعلیٰ اور برتر دیکھنا پسند فرمایا ہے۔

چنانچہ یورپ کو آج جو مادی ترقیات حاصل ہیں وہ صرف اسلام کا طفیل ہے
فرانسیسی مستشرق پروفیسر سدیو لکھتا ہے:-

"ہمارے موجودہ دور میں تمدن کے ہر ایک شعبۂ عمل میں اہلِ عرب کے اثرات
صاف طور پر نمایاں ہیں۔"

ڈاکٹر گستاؤلی بان دلی مشہور مورخ یورپ لکھتا ہے :-

"عربوں کی تجارت کا اثر مغرب میں اتنا ہی ہوا جتنا مشرق میں ہوا۔ انہی
کی بدولت یورپ نے تمدن حاصل کیا"

ہم کو عبادت کیلیے پیدا کیا گیا ہے :-

یہ جو خدا نے فرمایا ہے کہ ہم نے جن وانس کو عبادت کے لیے پیدا کیا ہے
مضمون عبادت سے اکثر پڑھے لکھے لوگ اس غلطی میں پڑے ہوئے ہیں کہ ایک
جب کہ اللہ نے ہم سے ہمارے رزق کا وعدہ فرمالیا ہے اور دوسری طرف اس
ہمیں عبادت کرنے کے لیے پیدا کیا ہے تو پھر ہم اس ناپاک دنیا سے کیا مطلب لگا
یہ خیال سخت ترین مہلک خیال ہے۔ جو ہرگز مطلوبِ خدا ورسول نہیں ہے۔ یہ
بے بصیرت لوگوں کی پیداوار ہے۔ اصل یہ ہے کہ ہر سلسلہ حیات میں اللہ نے انسا
اعتدال وترقی کا راستہ دکھلایا ہے اور اس پہ چلنے اور اس راہ سے خدا کے فضل
تلاش کرنے کا حکم دیا ہے اور ہر سلسلہ کی عبادت جداگانہ تجویز فرمائی ہے۔ عبد
کے معنی بندگی کے ہیں۔ خدا کا حکم یہ ہے کہ انسان جس سلسلہ کو بھی دنیا میں اختیار کر
اس کو بہرحال وبہر صورت احکم الحاکمین کا بدستور تابعدار بندہ ہونا چاہیئے۔

عبادت ایک مرکب چیز ہے جو بہت سے سلسلوں پر موقوف ہے۔ عبادت
و مال پر اپنی بنیادیں کھڑی کرتی ہے۔ عبادت کا حاصل یہ ہے کہ انسان اپنی جان اور
اور عزت واولاد وغیرہ سب کو خدا کی ملک سمجھتے ہوئے ان کو اس کی رضاء وخوشنو
کے لیے وقف کردے۔

عبادت کی قسمیں

عبادت کی متعدد قسمیں ہیں :-

بدنی عبادت :-

مثلاً ایک عبادت بدنی ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ بندہ اپنے اعضاء وجوارح کو مشغول اطاعت رکھے چنانچہ ہر روز پانچ وقت مسجد میں جاکر نماز جماعت کے ساتھ سترہ رکعتیں بلا کسی ریا کے ادا کرنا اور اپنے بدن کو ان حرکاتِ مقدسہ میں مشغول رکھنا نماز ہے۔ ہر سال ماہ رمضان المبارک میں ایک مہینہ تک مسلسل دن کے وقت کچھ نہ کھانا اور نہ پینا ہر قسم کی لذتوں اور خواہشوں سے اپنے جسم کو روک کر پاک وصاف رکھنا۔ زبان سے کسی بُری بات کا نہ نکالنا روزہ ہے۔ اپنے بدن کی قوت زنا ولواطت وغیرہ سے محفوظ رکھتے ہوئے ریزرو رکھنا اور اپنے جوہر بدن کو ضبطِ نفس اور ضبط کامل کے ساتھ اس کے صحیح مصرف میں میانہ روی کے ساتھ صرف کرنا دن رات اس کو بڑھانے کی فکر کرنا اور اپنے بدن میں فساد کی یہ سب صورتیں پیدا نہ کرنا اور وقت ضرورت بحکم امیر اسلام اپنی بہار شباب کو میدان جہاد میں ظالموں کی سرکوبی کے لیے اور مظلوموں کی حمایت کے لیے نچھاور کردینا جہاد ہے۔ یتیموں، بے کسوں، لاوارثوں کی غمخواری ودستگیری کرنا ان کے لیے چل پھر کر آسانی کی راہیں نکالنا اور ہر ایک امر میں مفاد امت ومفادِ ملت کو مفاد شخصی پر مقدم کرنا ایثار وخدمتِ خلق ہے یہ چاروں

شکلیں اور عمل کی قسمیں عبادت بدنی کے مفہوم میں داخل و شامل ہیں۔

قُربانی :-

حلال جانوروں کو وقت ذبح اس تکلیف شدید کے دوران میں خدا کا نام سنا کر ان کی غافل اور بہیمیت کی دلدلوں میں دھنسی ہوئی روحوں کو سدا کے لیے پاک اور بیدار کرنا پھر ان کے جسم ادنیٰ کو نوعِ آخرہ کے جسم اعلیٰ میں پہنچا کر اور ان کی غافل روحوں کو قربانی کے ذریعہ سے بیدار کر کے اُن کے جسم در روح دونوں کو معراجِ کمال پر پہنچانا اور ترقی دینا قربانی ہے۔

عِبادت مالی :-

ایک مسلمان کا تجارت و زراعت صنعت و حرفت اجرت و محنت کے ذریعہ سے اور حلال جائز راستوں سے حلال روزی پیدا کرنا اور اس قدر سرمایہ پیدا کر لینا کہ نہ صرف وہ اپنی ضروریاتِ زندگی ہی کو بآسانی پورا کر سکے بلکہ دوسرے نادار لوگوں کا بھی کفیل ہو سکے چنانچہ ہر سال ڈھائی روپیہ فی سینکڑہ اپنے زائد اور فاضل مال سے محروم الاسباب لوگوں کی خدمت کرنا اور ان کو عجز سے قُدرت دلانا۔ قرضداروں کا قرض ادا کر کے ان کی گردن قرض خواہوں سے چھڑانا کم از کم ایک مرتبہ خدا اور اس کے رسول کے گھر پر پہنچ کر ان کی زیارت کرنا اور اپنے مال کو اس کارِ خیر میں صرف کرنا۔ امیر اسلام کی اطاعت سے کبھی منہ نہ موڑنا۔ اور جماعتِ اسلامی سے کبھی علیحدگی نہ اختیار کرنا۔ بیت المال قائم کر کے امیر اسلام کے ہاتھ مضبوط کرنا۔ زکوٰۃ و صدقات اور حج وغیرہ

کہلاتے ہیں۔ یہ سب مالی عبادتیں ہیں۔ خدا کی عزت پر حملہ کفر کے وقت اپنی جان کو اس کے لیے قربان کر دینا۔ دو مسلمانوں کے جھگڑوں کو ایمان و انصاف سے نمٹا کر ان میں صلح و انصاف کرانا یہ عبادتِ جانی ہے۔

غرض ہر سلسلۂ زندگی میں خود غرضی و انفرادیت سے منہ موڑ کر باایثار زندگی بسر کرنا جملہ حالات و معاملات میں خدا کو سامنے رکھنا ہر کام کو نیک نیتی کے ساتھ کرنا۔ گھر بار ماں باپ بیوی بچوں اور اپنے جملہ اعزہ و اقارب و احباب وغیرہ کے حقوق کو ادا کرنا اور اس نیت سے ہر کام کرنا اس کا مجھے خدا نے حکم فرمایا ہے، عبادت ہے ہر خطہ زمین پر اللہ کے کلمہ کو بلند کرنا نظام خلافت قائم کرتے ہوئے خدا کی زمین کو شر و فساد اور شیطنت سے پاک کرنا یہ عبادت ملکی ہے۔

پس خداوند عالم نے ہر سلسلہ حیات میں مسلمانوں کو اعلیٰ و اشرف مرتبہ اختیار کرنے کا حکم دیا ہے اور جہاں نماز روزہ کی تاکید کی ہے وہیں تلاش فضل و رزق اور شکرِ نعمت کی بھی وصیت فرمائی ہے۔

غور سے دیکھیے تو پیدائش سے لے کر موت تک اگر سارے احوال میں بندہ خدا کو سامنے رکھے اور حزم و احتیاط اعتدال و تقویٰ کی راہ اختیار کرے تو اس کی پوری زندگی سراپا عبادت بن سکتی ہے۔ یہی اصلی مفہوم عبادَت کا ہے۔ یہ مفہوم عبادت نہیں کہ انسان تمام ضروریات اور عملی جدوجہد اور تلاش فضل کو بالائے طاق رکھ کر ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھا رہے چونکہ عام طور سے یہی مفہوم عبادت کا ذہنوں میں جم گیا ہے اسی لیے مسلمان باوجود دن رات عبادت کرنے کے آج دنیوی سربلندی سے محروم ہیں۔ جو عبادتیں مال کی فراوانی پر موقوف ہیں وہ بغیر سرمایہ دار بننے کے کیسے حاصل

ہوسکتی ہیں ۔ یا مثلاً جو عبادتیں جان کی بازیاں لگا دینے پر محمول ہیں جیسے جہاد قربانی بغیر مشقت اٹھائے ہوئے کیسے پوری ہوسکتی ہیں ۔ معلوم ہوا کہ عبادت ہر شعبہ زندگی میں خدا کو یاد رکھنے اور اس کو اس کی مرضی کے مطابق چلانے کا نام ہے جس کی ایک صورت نماز روزہ زکوۃ اور حج ہے اور دوسری صورتیں قربانی و جہاد ایثار خدمت خلق کی ہزاروں شکلیں ہیں ان سب عبادتوں کی جڑ تفکر ہے جس کی طرف سے ہم من حیث القوم غافل ہیں ۔ حالانکہ یہی تفکر وحیِ الٰہی کو سمجھنے کی ابجد ہے ۔

وحی کی قسمیں :-

جو وحی آخر نبیِ آخر صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوئی وہ دو قسم رکھتی ہے (۱) وحی متلو (۲) وحی غیر متلو ۔ وحی متلو یعنی جو وحی پڑھی گئی ہے اور بواسطہ ملک حضورؐ تک پہنچی اس کا نام وحی متلو ہے جس کا مرتب مجموعہ کلام الٰہی کہلاتا ہے اور فرشتوں کے واسطہ کے بغیر جو وحی قلب نبوی پر نازل ہوئی اس کا نام وحی غیر متلو ہے جس کے مجموعہ کا نام حدیثِ رسولؐ ہے ۔ پہلی قسم وحی کی علی الاطلاق بلفظہٖ واجب التعمیل ہے دوسری وحی رواۃ کے ثقہ و عادل ہونے کی صورت میں اور مضمونِ حدیث کے کلام الٰہی کے معارض اور متبائن نہ ہونے کی صورت میں علی القید واجب التعمیل ہے ۔

وحی کے آنے کی صورت یہ تھی کہ ابتداءً حضورؐ کو سچے خوابوں کے ذریعہ سے اَ واقعات عالم کی طرف توجہ دلائی گئی ۔ اس کے بعد فرشتہ علم نے آپ کو وحی آخرہ کی تعلیم دی ۔ اس کے بعد بغیر رویت فرشتہ کے بھی قلب نبوی پر وحی کا نزول ہوا ۔

نبی و غیر نبی کا فرق :-

ہمارے تمہارے جیسے انسان معمولی کہلاتے ہیں یعنی جن میں کثیف و لطیف دونوں مادے مجتمع ہیں اور ہماری روحوں کی جودت صرف اتنی ہی ہے کہ وہ ہمارے بدن میں تدبیر کریں کیونکہ ہم نفسِ امارہ کے شر سے اپنے حواسِ خمسہ کو قوی کرنے کی فکر نہیں کرتے اور اس کے برعکس انبیاء علیہ السلام کی بشریت و ملکیت دونوں کامل و اکمل تھیں ۔ انبیاء علیہ السلام کے اجسام طیبہ عالم کے ان روشن اور لطیف و منور یاروں سے ترکیب یافتہ تھے جو آج پھولوں اور پھلوں وغیرہ میں زیبِ بہار نظر آتے ہیں ۔ انبیاء علیہ السلام کے اجسام طیبہ میں کدورت کا کوئی سوال ہی نہ تھا بالفاظ دیگر یوں سمجھئے کہ نبی لاہوت و ملکوت و ناسوت کی ہر قسم کے انوار و برکات کے مظہر خاص اور ان کے نقطۂ اتصال تھے اسی لیے ان کے واسطے بحکم ایزدی چشم زدن میں آسمانوں پر اسی جسم کے ساتھ چلا جانا یا وہاں رہنا ذرا بھی دشوار نہ تھا ان کی قوی روحیں اس درجہ اپنے جسموں پر حاوی تھیں اور ان کا پاور اس درجہ بڑھا ہوا تھا کہ کسی مرحلہ پر بھی ان کی پاک روحوں سے ان کے لطیف جسموں کے ساتھ چھوٹنے کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا ۔ باقی موت چونکہ ایک اٹل فیصلہ قدرت ہے اور اس میں کسی نبی و فرشتہ تک کا استثناء نہیں ہے اس لیے یہ اسٹیج جداگانہ ہے جب بھی خدا نے انبیاء میں سے کسی کو آسمانوں پر بلایا تو ان کے پاک اور لطیف جسموں نے ذرا بھی اس سلسلہ میں حائل ہونے کی کبھی کوشش نہ کی ان کے لیے آسمانوں میں پہنچ جانا اور وہاں رہنا اتنا ہی آسان تھا جتنا آج ہمیں اور آپ کو سائنس کی بدولت اور پٹرول کی مدد سے بذریعہ ہوائی جہاز زمین سے پچاس پچاس ہزار فٹ اونچا ہوا میں اٹھ

جانا آسان ہے حضور کے لیے بھی معراجِ آسمانی کے وقت براق کی سواری آئی تھی
جو برق سے ماخوذ ہے۔

عقیدۂ معراجِ پیغمبرؐ و رفعِ مسیحؑ ناصری :-

اسی لیے دسواں عقیدہ و اقرار ہمارے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ ہم حضور سرور کائنات
صلی اللہ علیہ وسلم کی معراج آسمانی کو بجسدِ اطہر مانیں۔ اور جن مصالحِ تکوینیہ کے تحت حضرت
عیسیٰ کو سولی دیتے وقت آسمانی پر بجسدِ عنصری اٹھایا گیا اس کو صحیح گردانیں۔ حضرت عیسیٰ
قیامت کے قریب نبی آخر کے امتی بن کر دوبارہ زمین پر نزولِ اجلال فرما دیں گے۔
دجال کو قتل کریں گے اور دینِ اسلام کو ساری دنیا میں پھیلائیں گے۔

عقیدہ حیاتُ النّبیؐ :-

چونکہ انبیاء علیہم السلام کے اجسام طیبہ وسط عالم کے جوہری مادوں سے ترکیب
یافتہ تھے اور ان کو مٹی اس طرح سے نہیں کھا سکتی۔ اس لیے گیارھواں عقیدہ ہمارا یہ
بھی ہونا چاہیے کہ حضور پیغمبر آخر صلی اللہ علیہ وسلم اپنی قبر شریف میں زندہ سلامت ہیں
اور آپ کو پس وفات بھی ایک خاص قسم کا نور حیات حاصل ہے چونکہ اس عالم میں
موت کے قانون سے کسی کا استثناء نہیں۔ اس لیے بعد وفات آپ کا نور پاک اس
عالم سے اسی طرح سے اوجھل اور مستور ہے جس طرح سے کہ ایک روشنی کے ہنڈے
پر کوئی سرپوش ڈھک دیا جاتا ہے چونکہ آپ کا نور پاک سب سے پہلے پیدا ہوا اس
لیے اس نور پاک کا اپنے جسم پاک سے اتنا اتصال کچھ خلاف عقل بھی نہیں ہے جب کہ

عام مردوں میں بھی منکر نکیر کے سوالات کے وقت جان ڈال کر ان کو جواب دینے
کے قابل بنا دیا جاتا ہے تو حضور پیغمبر آخر کا مرتبہ تو ساری کائنات سے کہیں زیادہ
بڑھا ہوا ہے۔

نفوسِ قدسیہ کی اصولی طور چار قسمیں :-

جہاں تک برگزیدہ و صالح نفوس قدسیہ کے حالات و معاملات پر غور کیا گیا
اور عام اہل ایمان سے ان کے امتیاز کو جانچا گیا ہمیں تو بروئے تقسیم قرآنی اصولی
طور پر برگزیدہ بندوں کی چار ہی قسمیں نظر آئیں۔
اوّل نبی جن کی بشریت اور ملکیت دونوں درجہ کمال و جمال و جلال کے آخری
نقطہ پر واقع تھی نبی کی بشریت کو خلاصۂ عالم اجسام کہیئے اور ملکیت کو خلاصہ عالمِ ارواح
ملکوت سمجھیے نبی بشریت کے لحاظ سے فرشتہ بلکہ ان سے بھی دو قدم آگے۔ عام انسانوں
کے مادہ و روح میں اور نبی کے مادہ روح میں اشتراکِ لفظی ضرور ہے لیکن بلحاظ کیفیت
وعظمت زمین و آسمان سے بھی بڑھ کر نسبت ہے یہ قسم انسانوں کی نبی کریم صلی اللہ
علیہ وسلم کی بعثت کے بعد سے ختم ہو گئی ہے اب دنیا میں کوئی نبی نہیں آئے گا۔ ہاں
امتِ محمدیہؐ میں انبیائے سابقین کے مشابہ خلفائے رسالت اور مجدد وقتاً فوقتاً
ضرور رونما ہوتے رہیں گے۔
دوم صدیقین۔ صدیق اس کو کہتے ہیں جس کو راستی میں درجہ کمال حاصل
ہو جائے اور جو اپنے صدق کو اپنے عمل سے ثابت کر دے اس کا صدق اس کثرت
سے نمایاں ہو کہ لوگ آنکھ بند کر کے اس کے کہے پر عمل کریں۔ صدیقیت میں نور ایمان

چودھویں رات کے چاند کی طرح سے چمکتا ہے۔ صدیق، اصحاب اور صادقین کا بھی جوہر اور خلاصہ ہوتا ہے۔ صدیق وہ ہے جس کی روحانیت پر صدق کا رنگ اس درجہ چڑھ جائے کہ کذب کو وہاں تک پہنچنے کی ہمت ہی باقی نہ رہے صدیق کی ملکیت اس کی بشریت کے مقابلہ میں زیادہ رنگ کمال رکھتی ہے۔

سوم شہداء۔ شہید کی جمع شہداء ہے۔ شہید وہ ہے جو ہر ایک سرفروش کو اپنے جمال جہاں آرا کا شاہد بنا کر ان سب کا محور مرکز بن جائے۔ جس میں جذبہ فنائیت غالب ہو اسی لیے شہید کی جسمانیت زیادہ لطافت و کمال ہوتا ہے اور اس کا جسم اس کی روح کی ابدی بیداری اور دائمی بلندی و شرف کا ذریعہ بن جاتا ہے۔

چہارم صالحین: یعنی جن کے فکر و عمل میں اعتدال نمایاں ہو اور جن میں تخریب کے بجائے تعمیری صلاحیتیں زیادہ ہوں اور جن کے ظاہر و باطن سے آثار صلاح و رشد ظاہر ہوتے ہیں اور ہر ایک سلسلہ حیات میں جن کا فکر و عمل افراط و تفریط سے خالی ہو۔ چونکہ نبوت ختم ہو گئی اس لیے اب دنیا میں مذکورہ بالا تین ہی قسم کے برگزیدہ لوگ موجود رہتے ہیں پھر ان میں بھی باہم متعدد مراتب و درجات ہوتے ہیں جن کی تفصیل کا یہاں موقع نہیں اس موقع پر بس اتنا ہی اشارہ کافی ہے کہ صدیقین شہداء و صالحین کی ہی ہر شکلوں میں قیامت تک قطب، غوث، ابدال، امام، ولی، مصلح، مجدد، مجاہد، خلفاء اسلام پیدا ہوتے رہیں گے۔

جن اہل سعادت کا تعلق سرفروشی سے ہوگا وہ مجاہد و شہداء کی فہرست میں شمار ہوں گے اور عملی کمال کے مظہر خاص کہلائیں گے اور جن کا تعلق علمی کمال سے ہوگا انہیں صدیقیت کے زمرہ میں محسوب کیا جاتا رہے گا۔ اور جن میں کمال اصلاحیت پایا جائے

ان کو زمرہ صالحین میں شمار کیا جاتا رہے گا۔

غرض صدق و صلاح و شہادت تین اصولی اور اہم عنوان سعادت ہیں جن کے تحت میں جملہ مقدسین عالم آجاتے ہیں اور ان سب کا مرجع اول و آخر جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں جو سرمنشا کمالات نبوت ہیں۔

پیغمبر آخر صلی اللہ علیہ وسلم :-

اسی لیے بارھواں عقیدہ و اقرار ہمارے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ ہم خاتم الانبیاء جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خدا کے سب سے افضل و برتر جانیں اور آپ کے ظہور جسمانی کو سب انبیاء کا آخر قرار دیں جن کے بعد بوجہ تکمیل دین اب نہ کسی نبی کے آنے کی ضرورت باقی ہے اور نہ کسی جدید شریعت و الہامی کتاب کی اور یہ کہ حضورؐ کے بعد خلافت رسول کو علیٰ منہاج الرسول قائم رکھنا ہمارا سب سے بڑا بنیادی فریضہ ہے جس سے اسلام کی اجتماعی مہمات وابستہ ہیں۔

حدیث میں ہے کہ جو شخص خلیفہ و امام وقت کو اپنے زمانہ میں نہ پائے وہ جاہلیت کی موت پر مرے گا۔ اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ خلافت کی اہمیت و ضرورت کس درجہ ہے اور اگر غور سے دیکھا جائے تو بغیر نظام خلافت کے اسلام اپنی اصلی شکل و صورت میں کسی طرح سے ظاہر ہو ہی نہیں سکتا۔ کیونکہ ملک اور دین دو جوڑواں بھائی ہیں جن میں سے ایک بھی نہ ہو تو دوسرا بیکار ہو کر رہ جاتا ہے۔ حضور کی بعثت سے انتظام دین و نظام ملک دونوں پورے طور سے مکمل ہو چکے ہیں۔ حضور خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کو چودھویں رات کے چاند کی مانند خیال کیجئے۔ نبوت کے چاند کے مکمل

ہونے تک جس قدر انبیاء مبعوث ہوئے جن کے اوّل آدم علیہ السلام ہیں اور آخر عی
علیہ السلام ہیں ان کو نبی کے نام سے یاد کیا جاتا ہے اور حضور کی وفات کے بعد سے
قدر آپ کے نائب اور جانشین و ولی قطب امام و مجدد گزرے یا آئندہ گزریں گے
کو عترت کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ قرآن بمنزلہ سورج کے ہے جو نہ گھٹتا ہے نہ بڑھ
ہے اور اس کے مقدس حامل یعنی عترت اظہار بمنزلہ چاند کے ہیں جو ہر زمانہ میں کم و بیش
پیدا ہوتے رہیں گے۔ نبوت کبریٰ و رسالت محمدی کے عروجی دور میں جس قدر مؤید من
نفوس قدسیہ گزرے وہ نبی کہلائے اور آپ کے نزولی دور میں جس قدر مصلح مجدد آ
مقدر ہیں وہ عترت کے لقب سے ملقب ہیں۔ انبیاء کو عترت نہیں کہا جا سکتا اور عتر
کو نبی کے نام سے نہیں پکارا جا سکتا۔

حضور کی بعثت تک وحی کا سلسلہ جاری رہا آپ کے بعد ختم ہو گیا۔ لہٰذا قادیا
گروہ جو حضور کی وفات کے بعد بھی سلسلۂ وحی کو قائم کہتا ہے اور مرزا غلام احمد کو
اور مسیح موعود مانتا ہے وہ کافر مرتد ہے اور حضور کے ارشاد لا نبی بعدی (یعنی
میرے بعد کوئی نبی نہیں) کا صریح مخالف ہے جس کا نام مسیلمۃ الہند قادیانی جماعت ہے
اس جماعت سے نکاح بیاہ اور موالات و تعاون سب ناجائز ہے یہ کھلے کافر و
بھی زیادہ شدید کافر و مرتد جماعت ہے اسلام کی بناء توحید باری تعالیٰ اور رسالت
آخر پر ہے یہ جماعت حضور کی ختم رسالت کی منکر ہے اس لیے بالیقین کافر ہے ا
دائرہ توحید و رسالت سے کلیتہً خارج ہے اس گمراہ جماعت کے دام فریب سے بچنے
کی اشد ضرورت ہے ان کا اظہار اسلام بیخ کنی اسلام کے لیے ہے۔

صحابہ رض و اہل بیت رض

آپ کا فیض نبوت و اثر صحبت جن برگزیدہ نفوس قدسیہ کو پہنچا ان کی دو قسمیں ہیں (۱) صحابہ (۲) اہل بیت، جن کو حضور کا فیض صحبت حاصل ہوا۔ ان کو صحابی کہتے ہیں اور جن اہل ایمان کو حضور سے کسی قسم کی قرابت نسبی حاصل ہے انہیں اہل بیت کہا جاتا ہے۔

قدر مشترک ان دونوں قسموں میں صحبت و رفاقت نبوی ہے۔ جو باعث صد مجد و شرف ہے صحابہ و اہل بیت معصوم نہیں البتہ شجر نبوت کے ثمرات صالحہ ضرور ہیں صحابہ کرام میں سے دس بزرگ ترین صحابی ہیں جن کے جنتی ہونے کی بشارت حضور نے وحی الٰہی سے دی ہے ان کے اسماء گرامی یہ ہیں:۔

ابوبکر، عمر، عثمان، علی، سعد، سعید، ابوعبیدہ، طلحہ، عبدالرحمن بن عوف، زبیر۔

صحابہ میں سب سے بڑا مرتبہ حضرت ابوبکر صدیق رض کا ہے اس کے بعد حضرت عمر رض کا پھر حضرت عثمان رض کا پھر حضرت علی رض کا۔ باقی بلحاظ فضائل جزئیہ ہو سکتا ہے کہ ان میں سے کوئی کسی فضیلت جزئیہ کے لحاظ سے اپنے ہمعصروں سے بڑھا ہوا ہو۔ باقی یہ مراتب فضیلت جو بیان کیے گئے ہیں۔ بلحاظ مجموعی فضائل کے ہیں۔ اہل بیت میں حضرت فاطمہ حضرت عائشہ اور حضرت عباس، حضرت حمزہ، کل ازواج مطہرات، امام حسن و حسین اور دیگر مسلم اعزہ و اقارب رسول سب داخل و شامل ہیں۔

اہل حق کے نزدیک صحابہ و اہل بیت دونوں معظم و محترم ہیں اور ہم ان کے باہمی اختلافات میں کسی کو بھی برا کہنا جائز نہیں سمجھتے۔ ہماری محبت کا مرکز صحابہ و اہل بیت

دونوں ہیں۔ یہ گویا نبوت کی دو آنکھیں ہیں جن کے نور سے اسلام ہم تک پہنچا ہے باقی باوجود ہر ایک کے نیک نیت ہونے کے خطائے اجتہادی ہر ایک سے ممکن تھی مسلمانوں کی بدقسمتی سے اور عبداللہ بن ابی منافق اول کی اولاد کی مسلسل نسلی ریشہ دوانیوں سے اب نسلی طور پر اہلِ بیت اور صحابہ کی محبت کے لحاظ سے دو فرقے سمجھے جاتے ہیں۔ ایک وہ فرقہ جو بلا کسی انتخاب کے اہل بیت ہی کو رسول آخر کی جانشینی کا حقدار سمجھتا ہے۔ دوسرا فرقہ وہ جو اس حق کو عامۃ مسلمین کا حق جان کر پوری قوم کے نزدیک جو منتخب ہو جائے اس کو جانشین و خلیفۂ رسول سمجھتا ہے۔

پہلے فرقہ کو شیعہ کہتے ہیں۔ دوسرے فرقہ کو اہلِ سنت والجماعت کہتے ہیں۔ شیعوں کا عقیدہ یہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد امام برحق علی رضی اللہ عنہ تھے اور ان کے بعد ان کے خلفِ اکبر حضرت حسنؓ تھے اور ان کے بعد ان کے چھوٹے بھائی حسینؓ تھے ان کے بعد ان کے بیٹے زین العابدین ان کے بعد ان کے بیٹے محمد باقر ان کے بعد ان کے بیٹے جعفر صادق ان کے بعد ان کے بیٹے موسیٰ کاظم ان کے بیٹے علی رضا ان کے بعد ان کے بیٹے محمد تقی ان کے بعد ان کے بیٹے علی تقی ان کے بعد ان کے بیٹے حسن عسکری ان کے بعد ان کے بیٹے مہدی ہیں جو اس وقت تک غار سرمن رائے میں چھپے ہوئے ہیں۔ شیعوں کے یہی بارہ امام ہیں۔

اور اہل حق کا عقیدہ یہ ہے کہ اعوانِ رسول میں بلحاظ قدامت و رفاقت سب سے اول حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ تھے۔ جن کو حضور کی وفات کے بعد کل اصحابِ رسول نے باتفاق رائے خلیفۂ رسول منتخب فرمایا۔ اور اس کے بعد انہوں نے حضرت عمرؓ کو منتخب کیا۔ حضرت عمرؓ نے اپنی شہادت کے وقت چند اشخاص کے درمیان

خلافت کو دائر فرمایا۔ چنانچہ حضرت عثمان خلیفہ سوم مقرر ہوئے۔ اور اس کے بعد حضرت علی خلیفہ چہارم مقرر ہوئے پھر حضرت حسن کو منتخب کیا گیا۔ لیکن جب خلافت کے مسئلہ پر جھگڑا شروع ہوا تو حضرت حسن نے تفریق بین المسلمین سے بچنے کے لیے خلافت سے کنارہ کشی اختیار فرمائی اور اس طرح سے خلافت معاویہؓ کو منتقل ہو گئی اور اس کے بعد یزید کو جس نے امام حسینؓ کو شہید کرایا۔

چنانچہ اسی تغلب کی بناء پر اہل حق کے یہاں خلافت دو طرح کی مانی گئی ہے۔ ایک وہ خلافت جو علیٰ منہاج النبوت ہو۔ ایسی خلافت کو خلافتِ راشدہ کہتے ہیں جو حضرتِ ابوبکرؓ سے لے کر حضرتِ علیؓ تک رہی اور دوسری خلافتِ ملکیہ ہے جس میں امارت و ملوکیت کی شان غالب ہو خلافتِ غیر راشدہ ہے جو حضرت معاویہ کی خلافت ہے۔

فی الحقیقت خلافت مسلمانوں کی اجتماعیت اور ان کی نظم میں وحدت پیدا کرنے اور ان کو تفریق و ذلت سے بچانے کے لیے ہے اہل بیت میں سے اگر اس کا کوئی اہل متقی صالح شخص ہو وہ بلاشبہ خلافت کا مستحق اول ہے لیکن اگر اہلِ اسلام اہل بیت کے علاوہ بھی کسی کو اس منصب کا اہل سمجھ کر منتخب کر لیں تو یہ بھی ان کا ایک حق ہے اس کو غصبِ خلافت اور سنیوں کو گالیاں دینا حضرات صحابہؓ کو غاصب قرار دینا یقیناً نادرست و ناروا ہے اور سوءِ اخلاق و سوءِ خاتمہ کی نشانی ہے۔

اسلام ایک عالم گیر مذہب ہے وہ کسی نسل یا ملک و وطن کے ساتھ مخصوص نہیں ہے نہ کسی خاص نسل کو اس نے اپنا موقوف علیہ ہی ٹھہرایا ہے۔ اس نے اپنی

عمومیت وہمہ گیری کو ہر حال میں مقدم سمجھا ہے اسی لیے جس طرح سے حضور سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم اپنی حیات میں حضرات صحابہ سے مشورہ فرماتے تھے۔ اور جو رائے منقح ہوجاتی تھی اس پر عمل فرماتے تھے یہ نہ دیکھتے تھے کہ کہنے والا میرے اہل بیت میں سے ہے یا نہیں۔ اسی طرح سے عام مسلمانوں کا انتظام کرنے کے لیے بسلسلۂ خلافت عامۂ مسلمین کا بھی یہ حق ہے کہ وہ منصب خلافت کا جس کو اہل سمجھیں اس کو منتخب کرلیں خواہ وہ اہل بیت میں سے ہو یا حضراتِ صحابہ اور ان کی نسل سے ہو۔ اہل بیت کی محبت کے معنی یہ نہیں کہ ہم پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا حضرت عباس اور ان کی اولاد کو اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی بیویوں اور ان کے خاص خادموں کا فرو مرتد کہیں اور امام حسین کی اولاد میں سے ایک بھائی کو امام کہا جاوے اور دوسرے بھائی سے تبرا کیا جاوے بلکہ حقیقی محبتِ رسول یہ ہے کہ ان سب کو واجب الاحترام سمجھا جائے اور منصب خلافت پر اسی شخص کو قائم کیا جائے جو ہر زمانہ میں آزاد ہو، بہادر ہو، مرد ہو، بالغ ہو، نسبی طور پر اعلیٰ واشرف ہو صاحب علم وعقل وحکمت ہو، احکامِ شرعی کے اجراء کی صلاحیت کامل لیے ہوئے ہو۔ اور اس کی برتری ودیانت مخلوق کے لیے امر ظاہر ہو۔ ایسے ہی شخص کو خلیفہ رسول بنانا چاہیئے۔ اگر وہ قریشی یا ہاشمی ہو تو نور علیٰ نور ہوگا۔ باقی نفسِ شرافت نسبی بھی کافی ہے۔

اہلِ حق کے نزدیک اطاعتِ حق تین قسموں پر مشتمل ہے:-

اوّل اطاعتِ مطلقہ جو خداوند عالم کے لیے مخصوص ہے۔

دوئم اطاعت بشریہ جو رسول آخر صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے مخصوص ہے۔

سوئم اطاعتِ حکمیہ جو امیر اسلام کے لیے ہے جو صرف خدا اور رسول کے احکام کو نافذ کرنے والا ہے۔ باقی شیعوں کے اماموں کی طرح سے امیر احکاماتِ رسول میں تغیر وترمیم کا مجاز نہیں ہے۔ امیر کی اطاعت اس وقت تک واجب ہے جب تک اس کے احکامات اللہ اور اس کے رسول کے احکامات کے مطابق ہوں۔ اسی لیے اگر امیر مسلط فاسق وفاجر بھی ہو لیکن احکامِ شریعت کو بطریقہ معروف جاری کرتا ہو تو اس کی اطاعت سے خروج جائز نہیں ہے کیونکہ اصل مقصد احکام الٰہی کا نفاذ اور ان کی شوکت کا قیام ہے۔ امیر کے ذاتی احوال سے اس صورت میں تعرض نہیں کیا جائے گا۔

مُعجزاتِ انبیاء :-

تیرھواں عقیدہ ہمارا یہ ہے کہ پیغمبر خدا کو خدا کی طرف سے بہت سے مُعجزات بھی بطور دلیل نبوت عطا کیے گئے تھے۔ معجزے کی غرض وغایت نبوت کی تصدیق اور مخالفینِ نبوت کو مشاہدہ کی راہ سے عاجز کرنا ہے۔ ہر پیغمبر کو خدا کی جانب سے کچھ نشان اور معجزے اپنی قوم کے حسبِ حال عطا فرمائے گئے تھے۔

جیسے مثلاً حضرت موسیٰ کو عصا کا اور یدِ بیضا، وغیرہ کا معجزہ دیا گیا۔ یا مثلاً حضرتِ سلیمان کے لیے ہوا کو مسخر کیا گیا۔ مُعجزہ کا اطلاق صرف انہی نشانات قدرت پر ہوتا ہے جو نبی سے ظاہر ہوں۔ غیر نبی سے جو نشانات بطور خرق عادت ظاہر ہوں، انہیں معجزہ نہیں بلکہ کرامت کہا جاتا ہے۔ خرق عادت کے طور پر کچھ نئی نئی سی باتیں جوگیوں اور دیگر مذاہب کے مرتاض لوگوں سے بھی صادر ہوسکتی ہیں اور جادو ٹوٹکے اور سفلی اعمال کے اثرات تو اس زمانہ میں بہت ہی شائع ضائع ہیں لیکن معجزہ وخوارقِ عادات اور

جادو ٹونکوں وغیرہ میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ معجزہ وہ ہے جس کا توڑ کر
سے ممکن نہ ہو اور جس کا منبعِ صدور نبی کی ملکیت اعلیٰ و ارفع اور خرقِ عادت
وہ امور ہیں جو غیر نبی کی قوتِ نفسیہ سے صادر ہوتے ہیں۔ سو اگرچہ یہ دونوں
و شباہت کے لحاظ سے کچھ ملتے جلتے نظر آتے ہیں۔ لیکن غور سے دیکھا جائے
معجزہ و غیر معجزہ میں زمین آسمان کا فرق ہے۔

معجزہ وکرامت وغیرہ کا باہمی فرق :-

الغرض جو چیز بطورِ خرقِ عادت یعنی غیر متوقع طور پر کسی نبی سے ظاہر ہو ا
معجزہ کہتے ہیں۔ جیسے درختوں کا انبیاء سے کلام کرنا، چاند کو اشارے سے دو
کر دینا، مردوں کو زندہ کر دینا۔ تھوڑے سے کھانے اور پانی سے پورے لشکر کو سیرا
و شکم سیر کر دینا، مٹھی بھر جماعت سے کفر و الحاد کی تاریکیوں کو چھانٹ دینا وغیرہ وغیرہ ج
امور نبی سے یا نبی کی وجہ سے قبل از نبوت خرقِ عادت کے طور پر ظاہر ہوئے ان ک
ارہاص کہتے ہیں جیسے اصحابِ فیل کا تباہ ہو جانا یا مثلاً ولادتِ نبوی کے وقت قیص
کسریٰ کے محلات کے کنگروں کا گر جانا، آتش کدہ مجوس کا باوجود صدیوں سے مسلسل سلگ
رہنے کے ایک دم ٹھنڈا ہو جانا۔

المختصر کوئی چیز بطورِ خرقِ عادت کسی ولی سے ظاہر ہو اسے کرامت کہتے ہیں
اور اگر کسی غیر مسلم سے بسبب ریاضتِ نفس کے کوئی اعجوبہ رونما ہو، اسے قضا
حاجت یا استدراج کہتے ہیں۔ جو اس کے لیے مزید گمراہی کا ذریعہ بنتا ہے اور اگر
ناپاک اعمال اور منتروں سے کوئی اثر کسی کے ظاہر و باطن میں قائم کیا جاوے اُ

کو کہتے ہیں اور اگر کوئی شخص حضور خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد نبوت کا مدعی
بن کر کسی خرقِ عادت کا دعویٰ کرے جس کو حق تعالیٰ کبھی پروان نہیں چڑھاتے اس
کو اہانت کہتے ہیں جیسا کہ مسیلمہ کذاب نے حضور کے بعد دعویٰ نبوت کیا تھا۔ مسیلمہ
سے ایک شخص نے کہا۔ کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک شخص کی ایک اندھی آنکھ کو
درست کر دیا تھا تو تو اگر سچا نبی ہے تو بھی ہمیں ایسا ہی کر کے دکھلا۔ مسیلمہ نے ایک
کانے شخص کے لیے دعا کی اس کی دوسری آنکھ بھی پھوٹ گئی۔ یا جیسا کہ مدعی نبوت
مرزا غلام احمد قادیانی کا محمدی بیگم سے نکاح کا قصہ اور دیگر دعوے ہائے اعجاز غلط
ثابت ہوئے۔

بہر حال ہمارے حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے یوں تو کئی سو معجزات
ہیں یوں تو آپ کا ہر فعل درحقیقت ایک اعجاز لیے ہوئے تھا۔ چنانچہ عملی دنیا میں
آپ کا یہ معجزہ کیا کم ہے کہ عرب کے خونخوار وحشی جاہل بے بہرہ بدوؤں کو آپ نے
بغیر کسی سے تعلیم حاصل فرمائے ہوئے وہ تعلیم دی کہ کچھ ہی عرصہ میں وہ عالم کے سردار
بن گئے اور جس سلسلہ حیات کی طرف بھی اس کے بعد وہ متوجہ ہوئے ساری دنیا
کو ان کے آگے زانوئے ادب ہی تہہ کرنا پڑا۔
لیکن آپ کے دو معجزے بہت اہم شمار ہوتے ہیں۔

معجزۂ قرآن :-

ایک قرآن حکیم ہے جو کلیاتِ عالم اور اصولِ فطرت کا ایک ایسا جامع مرقع ہے کہ
قیامت تک جس قدر بھی حوادثات و احوال و واقعات و تغیرات دنیا میں رونما ہوں

گے وہ ان اصول اور کلیات سے باہر کسی طرح بھی نہیں جا سکتے ۔ قرآن کریم
فطرت ہے جس نے انسان کی ملکی بہیمی، غضبی ہر سہ قوتوں کی جملہ اصولی خوبیاں
معہ امثال ونظائر وشواہد کے مکمل مرتب طور سے پیش کی ہیں وہ تمام انبیاء کا
جامع خلاصہ ہے جو بلحاظ بیان وترتیب وفصاحت بے مثل ہے جس کی نظیر
سے جن وانس قاصر ہیں ۔

معجزۂ شق القمر :-

دوسرا معجزہ شق قمر کا معجزہ ہے جس کی اہمیت کا احساس فرماتے ہوئے
کریم نے اس کا خاص طور پہ ذکر کیا ہے ۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی انگلی
اشارے سے چاند کے دو ٹکڑے فرمائے ۔ اس معجزہ سے نظامِ علوی میں جو
انقلاب آیا اور اس کی وجہ سے زمین کے نظام پر اس کا جو اثر برپا ہوا وہ ایک
ایسا معجزہ ہے جس کو ہم لوگ نہیں جان سکتے ۔ یہ خصوصیت صرف چاند ہی کو حا
ہے کہ وہ متضاد کواکب وسیارات کے اثرات کو بیک وقت اپنے اندر لیتے ہو
اپنی عروجی ونزولی رفتار میں علیحدہ علیحدہ ان کو اہل عام پہ طاری کیا کرتا ۔

جس فرقانی ساعت میں چاند کے دو ٹکرے ہوئے وہ ساعت ایک ایسی
ساعت تھی جس میں زہرہ، مشتری اور شمس کا عمل ایک جانب مجتمع ہو گیا تھا ۔ ا
ان کے بالمقابل مریخ، وزحل اور عطارد کا عمل دوسری جانب اسی انداز سے مساو
طور پر مجتمع ہو گیا تھا ۔

مذکورہ بالا چھ سیاروں کے متضاد عمل نے ایک ایسی کشمکش کی صورت پیدا

کر دی تھی کہ اس کے بعد جس طرف بھی سیارہ قمر ہو جاتا وہی جانب ہمیشہ کے لیے
عالم پہ باذن اللہ اثر انداز رہتی ۔ مثلاً اگر سیارہ قمر زہرہ ومشتری وشمس کی جانب ہو
جاتا ۔ تو اس عالمِ سفلی میں ہمیشہ کے لیے باذن اللہ خیر کا ظہور ہوتا رہتا ۔ اور اگر بجانب
مریخ وزحل وعطارد اس کی حمایت ہوتی تو ہمیشہ کے لیے اس عالم میں باذن اللہ شر
کا ظہور رہتا ۔ اسی نزاکت کا احساس فرما کر جناب خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم نے
چاند کو دو حصوں پر اس ساعت میں منقسم فرما کر ہر دو قسم کے متضاد سیاروں میں ایک
اعتدالی ومساوی صورت پیدا کر دی اور دونوں کے متضاد اثرات سے جو ایک
تخریبی صورت سی پیدا ہو چلی تھی اسے رفع کر دیا ۔ اس بنیادی فرقانی ساعت میں
جو ساعت کی صدیوں کا خلاصہ لیے ہوئے کبھی کبھی آتی ہے اگر پورا چاند کسی ایک
جانب بھی مائل ہو جاتا تو پھر اس بزمِ اضداد واختلاف کے پروان چڑھنے کی کوئی صورت
نہ ہوتی کیونکہ دوسری جانب کے لیے فنا یقینی تھی ۔ یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی جوتیوں
کا صدقہ ہے کہ نظامِ علوی میں آپ نے تطبیق کی صورت پیدا فرمائی اور آپ نے دنیا
کو دکھلایا کہ نظام علوی میں تطبیق بھی آپ ہی کی ملکیت اعلیٰ وارفع دے سکتی ہے اور
کسی مخلوق میں یہ قوتِ قدسی موجود نہیں ہے ۔

چاند کے دو ٹکڑے ہونے کا معجزہ ایک اہم تاریخ کا مالک ہے ۔ ہندوستان میں
راجہ بھوج پال نے بھی اس معجزہ کو اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا ۔ جو اس وقت اپنے بالا
خانہ پر مصروف عبادت تھا اور عجائباتِ فلکی میں مستغرق تھا ۔ صبح کو اس نے اپنے
وزیروں اور درباریوں سے اس کا تذکرہ کیا ۔ اسی وقت سے یہ واقعہ تاریخی طور
پر مشہور چلا آ رہا ہے ۔

رزق و عبادت و شکرِ نعمت اور ان کا باہمی علاقہ

چودھواں عقیدہ و اقرار ہمارے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ ہم رزق و روزی اور نفع و ضرر کا مالک صرف پروردگارِ عالم ہی کو سمجھیں اور اس کے سوا کسی کو وسیلۂ رزق کو رزاق و مالکِ رزق نہ جانیں نہ نفع و ضرر کی باگ ڈور ہی خدا کے سوا کسی کے لیے تسلیم کریں۔ نیز ہم سے جو شخص بھی تندرست رہ کر سن شعور و بلوغ کو پہنچے وہ سب سے پہلے اپنے پیروں پر کھڑا ہونے کی سعی کرے اور رزق حلال و پیشہ کمال حاصل کرنے کی جد و جہد کو پوری کاوش و کوشش کے ساتھ سرانجام دے لیکن لقمۂ حرام اور ذریعہ حرام سے اس طرح سے بچے جس طرح انسان سانپ اور بچھوؤں سے بچا کرتا ہے۔ حرام روزی سے انسان کا گوشت پوست تک حرام اور ناپاک ہو جاتا ہے۔ ہر شخص کا رزق حق تعالیٰ نے ایک ہی جگہ نہیں رکھا بلکہ ہر ایک شخص کے رزق کو کھیت کے دانوں کی طرح سے مختلف شکلوں میں بکھیر دیا ہے۔ لہٰذا ہمارا یہ فرض ہے کہ ہم اپنے رزق کو تلاش کرنے میں سستی نہ کریں۔ ہر شخص کے ساتھ حق تعالیٰ کا معاملہ جدا جدا ہے کسی کو اس عالم میں پنی تلی روزی دی جاتی ہے اور کسی کو زیادہ سے زیادہ فراخی دی جاتی ہے۔ آدمی کا کام کا دہ ہے جو ہر حالت میں صبر و قناعت سے اپنی روزی حاصل کرے خواہ اس کو کسی قدر دور جاکر وہ کیوں نہ حاصل ہو۔ جو شخص کسی کے آگے دستِ سوال دراز کرتا ہے وہ علاوہ اپنے کریکٹر کو داغدار و مجروح کر لینے کے فی الحقیقت اس پر بھی ایمان نہیں رکھتا ہے کہ مالکِ رزق حق تعالیٰ ہے۔ غیرت دار آدمی مرجانا پسند کرتا ہے لیکن دستِ سوال کبھی کسی کے آگے دراز نہیں کرتا۔ وہ ہاتھ جو داد بچارہ کر سخاوت کرتا ہے وہ اس ھک

ننگے ہاتھ سے جو مخلوق کے آگے دراز ہوتا ہے یقیناً بہتر ہے۔ ایک شاعر نے اسی مضمون کو بڑی خوبی سے ایک شعر میں یوں ادا کیا ہے ؎

دستِ سوال لاکھوں ہی عیبوں کا عیب ہے
جس ہاتھ میں یہ عیب نہ ہو، دستِ غیب ہے

فقر و افلاس سے بڑھ کر کوئی خطرناک دشمن نہیں۔ یہ قوموں اور ملکوں کی جڑوں تک کو کھوکھلا کر دیتا ہے۔ فقر و افلاس بسا اوقات کو کفر و بداخلاقی تک کا شکار کر دیتے ہیں پھر بسلسلہ استعمال رزق ہمارے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ ہم جس جوہر رزق کی بدولت ماں کے پیٹ سے دنیا میں آتے ہیں اور پل کر جوان ہوتے ہیں اس جوہر کی زیادہ سے زیادہ حفاظت کریں اور جو صحیح مصرف اس کے خدا نے معین فرمائے ہیں ہم میانہ روی کے ساتھ انہی میں اس کو صرف کریں کہ فی الحقیقت کسی نعمت کو صحیح اس کے صحیح موقعہ و محل میں صرف کرنا ہی شکرِ نعمت ہے۔

قرآن کریم میں حصولِ رزق کے ساتھ ساتھ جو عبادت کا ذکر فرمایا گیا ہے اس سے اشارہ اس طرف ہے کہ عبادت خمارِ رزق کو خمارِ شیطنت کی صورت میں تبدیل نہیں ہونے دیتی۔ یہ ایک ناقابلِ تردید حقیقت ہے کہ بدون عبادت کے نہ تو رزق ہی انسان کے سزاوار ہوتا ہے نہ اس کا جوہر رزق ہی اس شکل میں شیطان کی دست برد سے محفوظ رہتا ہے۔

غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ اس دنیا میں کامیابی کی تین منزلیں ہیں:-

پہلی منزل رزقِ حلال کے حصول اور اس کی جد و جہد ہے۔

دوسری منزل عبادتِ بے ریا ہے جو قوتِ رزق کو ٹھکانے لگاتی ہے اور بندہ

کا رشتہ اس کے خالق سے استوار کرتی ہے۔

تیسری منزلِ شکرِ نعمت ہے جو مزید نعمتوں کا پیش خیمہ ہوتی ہے۔

اے بچو! تم آدمی کے بچے ضرور ہو۔ مگر تم آدمی اس وقت بن سکتے ہو جب کہ تمہیں یہ تینوں مرتبے خاطر خواہ حاصل ہوں۔ جو ہر رزق سے انسان کی جسمانی قوتیں سطحِ جمال پر پہنچتی ہیں۔ عبادت سے اس کی قوتیں سطحِ کمال پہ پہنچتی ہیں اور شکرِ نعمت سے انسان سطحِ شکوہ و جلال پہ پہنچتا ہے۔ رزقِ حسن ضامنِ جمال ہے۔ عبادتِ بے ریا ضامن کمال ہے شکرِ نعمت ضامن جمال و جبروت ہے انہی تینوں مرتبوں سے انسان جلال و جمال کی ہر سہ راہوں کو بآسانی طے کر سکتا ہے۔

خداوند عالم نے تمہارے لیے اس عالم میں دو طرح کے رزق مہیا فرمائے ہیں:

۱۔ مادی رزق اور نعمتِ ہائے دنیا جن سے تمہارا جسم اور تمہاری بشری قوت پرورش پاتی ہے۔

۲۔ روحانی رزق یعنی قرآن و دین۔ اسلام جن سے تمہاری روح کو ابدی سکون و قرار ملتا ہے اور تمہاری ملکی قوت پروان چڑھتی ہے۔ خداوند عالم نے جسم و روح کی ان ہر دو غذاؤں کے حصول کو فرض قرار دیا ہے جیسا کہ فابتغوا عند اللہ الرزق و اعبدوہ واشکروا لہ ط والیہ ترجعون ہ سے یہ نظریہ قرآنی واضح ہے۔ فابتغوا عند اللہ الرزق سے جسمانی رزق کے حصول کو ضروری ٹھہرایا گیا ہے۔ اور واعبدوہ سے رزق روحانی کا حصول لازم قرار دیا گیا ہے۔ آدمی وہ ہے جو جسم کو بھی غذا دے اور اپنی روح کو بھی اس کی غذا پہنچائے۔ وہ آدمی آدمی نہیں جو جسم کو تو توانا و تندرست رکھے اور اپنی روح کو بھوکا مار دے۔ اور اس آدمی سے بڑھ کر تو

وئی بدبخت ہو ہی نہیں سکتا۔ جو حرام روزی سے اپنے جسم کو بھی بربادی کے گھاٹ ا کہ فنا سے قریب کرتا ہے اور اپنی روح کو بھی ظلمت مآب بناتا ہے۔

بہرحال یہ عقیدہ ایک مسلمان کے لیے ضروری ہے کہ ہمارا مُربی حقیقی اور پالنہار ند ہے جس نے ہماری روح اور ہمارے جسم کی پرورش کے لیے ان کے مناسب ال غذائیں دنیا میں مہیا فرمائیں اور ایماندار ماں باپ کو ان نعمتوں کا ذریعہ بنایا۔ ی لیے باوجود خدائے ذوالجلال کو پروردگار اور مربی حقیقی سمجھنے کے مربیانِ مجازی نی ماں باپ کے حقوق سے بھی قطع نظر کرنا جائز نہیں ہے جیسا کہ آیت کریمہ ان الذین الوا ربنا اللہ ثم استقاموا کے بعد ہی ووصینا الانسان بوالدیہ کے لہ وبیان اور ان کے باہمی ربط سے یہ نظریہ واضح ہے۔ ہاں مربیان مجازی مربی حقیقی یے مخالف ہوجائیں تو پھر مربی حقیقی ہی کے کہنے پر عمل ہونا چاہیئے۔ ان کا کہنا نہیں ماننا چاہیئے۔

محاسبۂ عالم اور جزا و سزا :-

پندرہواں اقرار و عقیدہ ہمارے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ ہم شخصی محاسبہ اور شخصی جزا و سزا پہ نظر کر کے کل عالم کے محاسبۂ جزا و سزا کا بھی یقین کریں اور اس پہ ایمان لائیں اور حضرتِ محاسب عالم جل مجدہٗ کو محورِ حساب و جزا قرار دے کر ہر یک ارادہ و قدرت کو اس کے آگے مسئول اور جواب دِہ تصور کریں اور یہ عقیدہ بھی دل میں راسخ رکھیں کہ حق تعالیٰ کبھی کسی کے ساتھ ظلم و ناانصافی نہیں کرتا مگر بخشش و درگذر ضرور فرماتا ہے۔ اسی کا نام فضل و مغفرت ہے۔ مغفرت کا دائرہ کفر د

شرک کے سوا ہر ایک گناہ کو اپنے اندر لیے ہوئے ہیں۔ فضل یعنی سے مخصوص

اور مغفرت گناہ سے فضل و مغفرت کا بڑا ذریعہ توبہ و دعا ہے۔ توبہ کا حق عام

اس سے کافر و مشرک بھی نفع اٹھا سکتے ہیں چونکہ نتیجہ ہمیشہ عمل کے بعد ظاہر ہوا کر

اس رفتار طبعی کے پیش نظر ہمیں اصولاً یہ بھی تسلیم کرنا ہوگا جو دار العمل ہوگا وہ دار

نہ ہوگا اور جو دار الجزا ہوگا وہ دار العمل نہ بن سکے گا۔ نیز دار العمل فانی کہلائے گا

دار الجزاء باقی رہے گا۔ یہ کلیہ بھی یاد رکھنے کے لائق ہے کہ ہر جزا ابدی ہوگی مگر ہر سز

نہ ہوگی۔ عالمِ جزا میں جسم وہی پرانا ہوگا جس سے روح عالم عناصر میں متعلق تھی الب

اس میں پہلے سے زیادہ ہوگی۔ اور اس پر بڑھاپا نہ آئے گا۔

بعث وقیامت اور ان کی تعریف وتفصیل :-

سولہواں اقرار ہمارے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ ہم بعث وقیامت کو حق

اور ان پر ایمان لائیں اور قیامت کے آنے سے پہلے اور اس کے بعد جن چیز

کی خبر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے دی ہے انہیں حق سمجھیں۔

بعث مرنے کے بعد قیامت میں دوبارہ اٹھنے کو کہتے ہیں اور قیامت

عالم کے درہم برہم ہو جانے کا نام ہے۔ بعث وقیامت ساتھ ساتھ ہونگے قیا

کا وقت بتعیینِ تاریخ و سنہ اللہ نے کسی کو نہیں بتلایا۔ البتہ اس کی کچھ علامتیں خا

رسول آخر علیہ السلام کو ضرور بتلائیں۔ یہ علاماتِ قیامت دو طرح کی ہیں۔ ایک د

قیامت کے قریب دیکھنے میں آئیں گی۔ دوسری جو قیامت کے شروع ہونے پر

ہونگی۔ معلوم ہوا کہ غیب کا علم صرف حق تعالیٰ کے لیے مخصوص ہے۔ ہاں وہ انبیا

اس پر ضرور مطلع کر سکتا ہے سو اس کے بعد وہ علم غیب علم شہادت کہلاتا ہے

قربِ قیامت کی علامتیں :-

قربِ قیامت کی چھوٹی چھوٹی علامتیں یہ ہیں :-

دھواں نکلنا، دجال کا ظاہر ہونا۔ ایک عجیب الخلقت چوپائے کا وجود میں آنا۔

سورج کا مشرق کے بجائے مغرب کی طرف سے نکلنا۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا آسمانوں

سے نازل ہو کر زمین پر اترنا۔ قوم یاجوج ماجوج کا پھیلنا۔ زمین کا دھنسنا۔ قتل ناحق کا

بکثرت ہونا۔ زمین پر شر و فساد کا بڑھ جانا۔ امام مہدی کا عرب میں ظاہر ہونا۔ صور پھونکنا۔

یمن سے آگ کا نکلنا۔ مردوں کا دوبارہ زندہ ہو کر جی اٹھنا وغیرہ وغیرہ

قیامت کے واقع ہونے کی علامتیں :-

عین قیامت کے اہم واقعات یہ ہیں :-

میدان قیامت کی طرف کا چلنا اور جمع ہونا۔ سوا نیزہ پر سورج کا اتر آنا۔ پلصراط سے

مخلوق کا گزرنا اور اس کو عبور کرنا۔ اعمال ناموں کا کھلنا۔ حضرتِ الٰہی سے ہمکلامی حاصل

ہونا، مستحقین کو شفاعتِ محمدی کا نصیب ہونا۔ جنت دوزخ میں اہل ایمان و کفر کا

داخل ہونا وغیرہ وغیرہ۔

نقشۂ قیامت :-

قیامت کا مرتب اجمالی نقشہ یہ ہے :-

جب عالم کا یہ نظامِ شمسی و قمری اپنی آخری مدت پر پہنچ جائے گا تو اسرافیل علیہ السلام صُور پھونکنے کی ابتدا کریں گے ۔ یہ پہلا صور ہوگا جس کی وجہ سے تمام عالم درہم وبرہم ہو جائے گا ۔ اس کا نام نفخہ فزع ہے ۔ اس کے بعد دوسرا صُور پھونکا جائے گا اس نفخہ ثانیہ میں ملک الموت تمام ذی روح مخلوق کی روحیں سوائے تیرہ افراد کے قبض کرلیں گے وہ تیرہ افراد یہ ہوں گے ۔ جبرائیل ، میکائیل ، اسرافیل اور عزرائیل ، آٹھ فرشتے عرش اٹھانے والے اور زمین پہ ابلیس (شیطان) ، یہ نفخہ نفخہ صعق ہوگا ۔ پھر ملک الموت ابلیس کی روح قبض کریں گے اور اس مردود کو اس کے اصلی ٹھکانے پر پہنچائیں گے پھر جملہ غیر ذی روح مخلوق کو فنا کریں گے ۔ پھر جبرئیل و میکائیل و اسرافیل اور حاملانِ عرش کی روحیں قبض کریں گے ۔ پھر بامر الٰہی خود جان دیدیں گے اس وقت تمام عالم تمام وکمال فنا ہو جائے گا ۔ صرف ذاتِ الٰہی باقی رہ جائے گی ۔ اس کے بعد حشر و بعث شروع ہوگا ، جس کی صورت یہ ہوگی کہ پہلے اسرافیل جلائے جائیں گے ، پھر جبرائیل ، میکائیل ، عزرائیل پھر رضوان پھر براق ، جو قبر نبوی صلی اللہ علیہ وسلم پر حضورؐ کی سواری کے لیے لایا جائے گا ۔ پھر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم زندہ فرمائے جائیں گے پھر وجود آفرین بارش ہوگی جس کی وجہ سے مخلوق گھاس کی طرح اُگ آئے گی پھر آلودہ معاصی زمین پاک و صاف کی جائے گی ۔ اس کے بعد اسرافیل علیہ السلام تیسرا صور پھونکیں گے اس سے تمام مردے جی اٹھیں گے ۔ یہ نفخہ نفخۂ البعث ہوگا پھر انسان قبروں وغیرہ سے مرتب ہو ہو کر مدت دراز تک ایک مقام پر کھڑے رہیں گے ۔ پھر میدانِ محشر میں لے جائیں گے ۔ اس وقت سورج بالکل ان کے سروں کے قریب ہو جائے گا ۔ پھر فیصلہ الٰہی اپنا کام کرے اور شفاعت محمدی اپنا کام کرے گی ۔ پھر جنت قریب کی جائے گی اور جہنم نکالا جائے گا

پھر اعمال نامے کھلیں گے ۔ پھر میزان عمل میں اعمال تولے جائیں گے ۔ پھر پل صراط سے گزارے جائیں گے جو پل کی طرح سے جہنم پر بنی ہوگی ، ہر مخلوق کو اس سے گزرنا ہوگا ۔ مومن بجلی کی طرح سے کوندکر اس پندرہ ہزار میل کی مسافت کو طے کرے گا ۔ اور کوئی اونٹ گھوڑے وغیرہ کی طرح ۔ منافق اس پہ چلنے سے اپنے کو عاجز پائیں گے اور جہنم ہی میں گر جائیں گے ۔ اس کے بعد نیک جنت میں اور بد جہنم میں داخل کر دیئے جائیں گے ۔ میدانِ محشر میں اہلِ ایمان کو جب پیاس کا انتہائی غلبہ ہوگا ۔ تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم حوض کوثر سے اپنی امت کو پانی پلائیں گے ، جس کا پانی دودھ سے زیادہ سفید ہوگا ۔ اور شہد سے زیادہ شیریں ہوگا ۔ اس کی خوشبو مشک سے زیادہ سہانی ہوگی ۔ ایک بار بھی اس کا پانی پیئے گا پھر کبھی پیاسا نہ ہوگا ۔ حوضِ کوثر کے آبخورے اتنی ہی زیادہ ہیں جتنے ستارے ، بلکہ اس سے بھی زیادہ ہوں گے ۔ جو لوگ اسلام کو قبول کرنے کے بعد مرتد ہو جائیں گے ، ان کو حضور اکرم اپنی حوض کے آس پاس بھی نہ آنے دیں گے باقی فردِ مشرک تو حوض کوثر کے پاس بھی نہ ٹھٹک سکیں گے ،"

حوضِ کوثر کا اس دنیا میں نقشہ دیکھنا ہو تو قرآن کریم کو دیکھ لو جس کو جتنی علمی پیاس ہوتی ہے ، اتنی ہی تشنگی وہ قرآن سے رفع کر لیتا ہے ۔

سب چیزوں سے فراغت پاکر موت ایک جانور کی شکل میں لاکر موت دی جائے گی جس کے بعد ناقابل معافی مشرک و کفار سدا جہنم میں رہیں گی ۔ اور اہل ایمان جنت میں پہنچ کر حیات اَبدی کے مزے لوٹیں گے اور دیدار الٰہی کی نعمت سے بہرہ ور ہو کر سدا سہاگ ہو جائیں گے ۔

عذابِ قبر ضغطۂ قبر سوالات منکر نکیر اور ایصالِ ثواب وغیرہ کا عقیدہ

سترھواں عقیدہ اقرار ہمارے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ مرنے کے بعد ہم عذابِ قبر اور سوالات منکر نکیر ۔ ضغطۂ قبر اور مردوں کے لیے ایصال ثواب کو حق جانیں اور اس سلسلہ میں جس قدر احادیث صحیحہ و نصوص قرآنیہ وارد ہیں ان سب پر دل سے ایمان لائیں ۔

سوالات نکیرین اور عذاب قبر :-

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب مردے کو قبر میں دفن کر کے اس کے اہل وعیال واپس ہوتے ہیں تو اس کے پاس دو فرشتے آتے ہیں (جن میں سے ایک کو منکر اور دوسرے کو نکیر کہتے ہیں) یہ دونوں فرشتے میت سے پوچھتے ہیں ۔ تیرا دین کیا تھا اور تیرا پروردگار کون ہے ۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی شبیہ مقدس دکھلا کر مردے سے یہ بھی دریافت کیا جاتا ہے تو نبی آخر محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کو کیسا جانتا تھا ۔ پس اگر مردہ مومن ہوتا ہے ۔ تو کہتا ہے میرا دین اسلام ہے ۔ میرا پروردگار اللہ ہے اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے بندے اور اس کے رسول اور ہمارے نبی ہیں ۔ اور اگر مردہ منافق یا کافر ہے ۔ تو اس کے جوابات کافرانہ مشرکانہ ہوتے ہیں ۔ پس اگر مردے کے جوابات حق ہوتے ہیں تو اس کے لیے جنت کے دروازے وا کر دیئے جاتے ہیں جس کی

سے مردے کو ہر قسم کی سہولت وراحت میسر آجاتی ہے ۔ اور قیامت تک وہ ایسی چین کی نیند سوتا رہتا ہے ۔ جیسے شب عروس میں ایک دلہن مزے کی نیند سویا کرتی ہے اور اگر مردہ کے جوابات کافرانہ ومشرکانہ ہوتے ہیں ۔ تو اس کو لوہے کے گرزوں سے مارا جاتا ہے جس کی وجہ سے مردہ چیختا چلاتا ہے ۔ جس کو سوائے جن وانس کے سب سنتے ہیں اور اس کے لیے جہنم کے دروازے کھول دیئے جاتے ہیں ۔ مردہ قبر میں دفنایا جاتا ہے تو منکر نکیر قبر میں پہنچ کر مردہ سے یہی سوالات کرتے ہیں اور اگر وہ پانی میں ڈبویا جاتا ہے تو پانی کی لہروں میں مردے سے اسی قسم کے سوال وجواب ہوتے ہیں اور اگر جلایا جاتا ہے تو اس شکل میں بھی یہی سوال وجواب ہوتے ہیں

باقی عالم برزخ میں مردہ کی روح پر ثواب وعقاب کی کیا کیفیتیں طاری ہوتی ہیں اس کو اللہ اور اس کا رسول ہی بہتر جاننے والے ہیں وہ اسی طرح سے عام نظروں سے اوجھل رہتی ہیں جس طرح کہ خود ہماری روح ہمیں نظر نہیں آتی ۔ البتہ بعض اوقات بندوں کی عبرت کے لیے عذاب قبر کا اثر جسم میت پر بھی ظاہر کر دیا جاتا ہے ۔ جو روحیں پاک اور مومن ہوتی ہیں ان کو حشر تک علیین میں رکھا جاتا ہے اور جو روحیں ظلمات کفر میں لپٹی رہتی ہیں ان کو سجین میں جگہ دی جاتی ہے ۔ گویا یوں سمجھیے کہ یہ ہر دو مقامات ارواح بشریہ کے لیے بمنزلہ دو مسافر خانوں کے ہیں ۔ جہاں قیامت تک نیک وبد روحیں ثواب وعقاب آخرت سے آشنا کرائی جاتی ہیں ۔

ضغطۂ قبر :-

ضغطہ کے معنی تنگی اور گھبراہٹ کے ہیں ۔ انگریزی میں اس کو شاک کہہ لیجیے جو

تھوڑی دیر کے لیے قبر میں مردوں کو پیش آتا ہے۔ ضغطۂ قبر سے نیک و بد دونو
کے بندوں کو واسطہ پڑتا ہے۔

چونکہ سب انسان ابن التراب ہیں یعنی مٹی کے بیٹے ہیں۔ اس لیے زمین
نیک فرزندوں کو غایت محبت سے دباتی ہے۔ جیسے دو بچھڑے ہوئے دوس
ایک عرصہ کے بعد آپس میں ملتے ہیں۔ تو شدتِ تعلق کی بنا پر بعض اوقات اس ز
ایک دوسرے کو دباتے ہیں کہ تکلیف کا احساس ہونے لگتا ہے۔ یہی صورت زمین
اپنے نیک فرزندوں سے ہوتی ہے۔ جو ان کے حق میں مزید تزکیہ کا باعث ہوتا
کے برعکس گنہگار فرزندوں کی زمین غایت قہر و غضب سے دباتی ہے جس کی د
مردے کی دونوں پسلیاں ایک دوسرے سے مل جاتی ہے جو اس کے حق میں ا
کا عذاب ہوتا ہے۔

باقی جو مُردے دفنائے نہیں جاتے ان کے لیے ضغطہ کی صورت ان
حال ہوتی ہے جس کا علم ہمیں نہیں دیا گیا۔ ہو سکتا ہے کہ دریا و سمندر وغیرہ میں ڈ
والے مردہ کو سمندر اور دریا وغیرہ بھی اسی طرح اپنی موجوں سے دباتے ہوں ا
میں جل کر ہوا میں اڑنے والے کو ہوا کا بگولا بھی اسی طرح دباتا ہو آخر تعلق تو ان
عناصر کو جسمِ انسانی سے ہوتا ہی ہے۔ باقی اصل عذاب و ثواب تو عالمِ برزخ
پر ہوتا ہے۔ گو کہ کبھی اس کی علامتیں جسمِ میت پر بھی عبرۃً نمودار ہو جاتی ہیں

کتبِ تواریخ میں ہے کہ ایک دن حضرتِ عثمان غنی رضی اللہ عنہ ایک قب
ہوئے اس قدر روئے کہ ڈاڑھی مبارک آنسوؤں سے تر ہو گئی۔ رفقاء نے
حضرت اس سے پہلے دوزخ کے ڈر سے ہم نے آپ کو کبھی اس قدر روتے

اس کا سبب کیا ہے۔ حضرت عثمانؓ نے فرمایا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
سے سنا ہے کہ عاقبت کی پہلی منزل قبر ہے جس کی یہ منزل آسان ہو جاتی ہے اس کی
بقیہ منزلیں بھی آسان ہو جاتی ہیں اور جس کو اس منزل میں تکلیف ہوتی ہے تو اس کی
باقی منزلیں بھی تکلیف سے گزرتی ہیں۔ اس لیے عاقبت اندیش وہ ہے جس کو اس
سے سب منزلوں کا غم ہو۔

مُردوں کیلئے ایصالِ ثواب :-

باقی از روئے عقل و نقل اس حقیقت میں کسی شبہ کی گنجائش ہی نہیں ہے کہ عالمِ
ارواحِ انسانی کا جو علاقہ آپس میں قائم ہے۔ یہ مرنے کے بعد بھی قائم رہتا ہے۔ اسی
لیے جب زندوں کی طرف سے مردوں کے لیے خیرات اور دعا کی جاتی ہے۔ تو اس سے
روح اور میت آرام و تسکین پاتی ہے اور عذاب قبر کم ہو جاتا ہے۔ اور بعض اوقات
صدقہ و استغفار و ایصالِ ثواب اور نیک اعمال کے ثواب پہنچانے سے عذاب قبر بالکل
ختم ہو جاتا ہے۔ چنانچہ نماز جنازہ اور اہلِ ایمان کا اپنی اموات کے لیے استغفار و
ایصالِ ثواب سب اسی لیے ہوتے ہیں کہ روحِ میت کو ان سے قرار و سکون میسر آئے
جب کوئی شخص مر جاتا ہے اور اس کے اہل و عیال یا اعزہ و احباب اس مردے کے
لیے کوئی نیک عمل کرتے ہیں۔ مثلاً مسکینوں کو کھانا کھلاتے ہیں یا کپڑا پہناتے ہیں یا
نقد دیتے ہیں یا نفلی نماز اور روزہ رکھتے ہیں یا قرآن شریف اور تسبیحات پڑھ کر یا
کوئی نیک عمل کر کے اس کا ثواب مردہ کو پہنچاتے ہیں تو حق تعالیٰ کی جناب سے اس کا
ثواب مردہ کو پہنچایا جاتا ہے۔

حضرتِ انس سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس شخص کے گھر والے میت کی طرف سے اس کی موت کے بعد اس کے لیے صدقہ دیتے ہیں تو فرشتوں کی طرف سے نور کے طباقوں میں ان صدقات کا نور سجا کر اس مردے کے پاس لایا جاتا ہے۔ جس سے مردہ بہت خوش ہوتا ہے اور اس کے آس پاس والے مردے جن کے پاس کسی نے ثواب نہیں پہنچایا غمگین ہوتے ہیں۔

ثواب پہنچانیکے طریقے :-

ثواب پہنچانے کے دو طریقے ہیں :-

ایک یہ کہ کوئی نیک عمل کرتے وقت ابتداءِ عمل میں یہ نیت کرے کہ میں فلاں شخص کی طرف سے نائب ہو کر یہ عمل کرتا ہوں اے اللہ اس عمل کا ثواب فلاں کو پہنچا یا جائے یہ صورت عبادتِ مالی میں مستحسن ہے۔

اور دوسرا طریقہ ثواب پہنچانے کا یہ ہے کہ جب کوئی شخص عبادت کر چکے اس وقت اللہ کی جناب میں دعا کرے کہ اے پروردگار تو اپنے فضل و کرم سے اس عبادت کا اجر و ثواب فلاں شخص کو بخش دے۔ ثواب پہنچانے کے لیے کوئی دن کوئی مہینہ مقرر نہیں ہے جب دل چاہے جس طرح سے چاہے ثواب پہنچایا جا سکتا ہے۔ البتہ جن ایام کی فضیلت شریعت سے ثابت ہے اگر ان میں ایصالِ ثواب ہو گا تو وہ یقیناً مزید اجر و ثواب کا موجب ہو گا۔ اگر کھانا کھلا کر ایصالِ ثواب ہو تو اس میں سرمایہ حلال شرط ہے اور یتیم و نادار مسکین و محتاج مسافر اور بیمار قیدیوں اور طالب علموں کو کھلانا زیادہ باعث اجر و ثواب ہے۔

باقی جو اہلِ بدعت نے ایصال ثواب کی مخصوص شکلیں خود گھڑ لی ہیں چنانچہ تیجا دسواں، چالیسواں وغیرہ کرتے ہیں اور یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ روح ان اوقات میں اپنے گھر آتی ہے۔ یہ سب باتیں بے اصل ہیں۔ ایصالِ ثواب کے لیے کوئی شرط نہیں ہے جتنی جس کو توفیق ہو خواہ کھانا کھلا کر یا قرآن وغیرہ پڑھ کر جب چاہے اپنے مردوں کو ان کا ثواب پہنچا سکتا ہے۔ خدا کے یہاں تو اس کی نیت اور پاکیزگی کو دیکھا جاتا ہے۔ وہ رسُوم مروّجہ کا پابند نہیں ہے۔ قرض لے کر ایصالِ ثواب درست نہیں ہے۔

علم دین کی طلب اور اس کی فرضیت :-

اٹھارہواں عقیدہ و اقرار بروئے ارشادِ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم یہ ہے کہ ہر مسلمان مرد و عورت پر علم دین کی طلب اور اس کے ضروری احکام و مسائل سے واقفیت فرض ہے جن کی بسلسلہ عبادات و معاملات دن رات ضرورت پیش آتی ہے۔ نیز طلبِ علم کے لیے ہر دور کے مناسبِ حال جس قدر وسائل و ذرائع ناگزیر ہوں ان کا بروئے کار لانا بھی ملت پر واجب ہے۔ جیسے مثلاً اجتماعاتِ مفروضہ جمعہ و عیدین اور ان کے خطبات سے زیادہ سے زیادہ فائدہ حاصل کرنے کی سعی کرنا۔ دینی مدارس جگہ جگہ قائم کر کے ان کے ذریعہ سے علمِ دین کی صحیح تعلیم کو نظامِ خلافت کے ماتحت جاری کرنا، موانعاتِ تعلیمی کو انفرادی و اجتماعی حیثیت سے دفع کرنا وغیرہ وغیرہ۔ اسی کے ساتھ علوم دینیہ کی تبلیغ و اشاعت کے زیادہ سے زیادہ سامان کرنا چنانچہ ہر مسلمان کا اپنے دیگر ابنائے جنس کو اپنے قول و عمل سے نیکی کا راستہ دکھلانا امور

معقول ومعروف کا لوگوں کو حکم کرنا اور اس کا عادی بنانا۔ بے جا امور اور برے اقوال واعمال سے لوگوں کو روکنا اور منع کرنا سب مسلمانوں کا ایک مشترکہ مذہبی فریضہ ہے جس کی ادائیگی سب پر واجب ہے۔ اس اہم اور بنیادی فریضہ کی ادائیگی سے اگر لاپروائی برتی جائے یا خوف وخوشامد اور مرعوبانہ ذہنیت سے اس فریضہ پر عمل نہ کیا جائے تو یہ کوتاہی یقیناً ملتِ اسلامیہ کے اجتماعی مفاد کے لیے سم قاتل ثابت ہوتی ہے۔ اور ناراضگی حق کا سبب اعظم بنتی ہے جس کا خمیازہ پھر ساری قوم کی بربادی کی صورت میں نمودار ہوتا ہے۔

اسلام ایک عالم گیر علمی وعملی تبلیغی وعمرانی مذہب ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ اس کا ایک ادنیٰ سے ادنیٰ فرد بھی جہالت ومعصومیت کی ظلمت میں گرفتار نہ ہو۔ بلکہ اس کا ہر ایک حلقہ بگوش اپنے دین کا عالم باعمل اور احکامِ ضروریہ کا واقف کار ثابت ہو۔ اور اس کی زندگی اس درجہ پاکیزہ ہو جائے کہ وہ اپنے صحیح علم کو دوسروں تک پہنچا کر انسانیت کا صحیح معنی میں حق ادا کر سکے۔ انس ومحبت کا فطری تقاضہ یہی ہے کہ جب کسی کو کسی برائی کا شکار دیکھا جائے تو مناسب وقت تدبیر حکمت عملی کے ساتھ اس کو برائی کے جنگل سے نکال لیا جائے اور جو بھی اچھی بات کسی سے ہاتھ لگے۔ اس کو اپنے دیگر ابنائے جنس تک پہنچا کر اپنی فطری محبت کا حق ادا کیا جائے یہ انس و محبت نہیں کہ انسان خود برائی کا ساتھی بن کر دوسروں کو بھی غلط راہ چلنے پر آمادہ کرے اور خود محور خود غرضی بن کر دوسروں کے لیے بھی عذابِ جان بن جائے۔ اسلام دنیا میں نیکی کو عام دیکھنا چاہتا ہے۔ اس کی ہمیشہ سے یہ خواہش ہے کہ برائی کا وجود اگر رہے بھی تو ذلیل و بے کس ہو کر رہے جب تک مسلمان امر بالمعروف اور نہی عن المنکر

کے عامل اور عادی رہے۔ سچائی کو انہوں نے حرزِ جان بنایا اور اپنوں اور پرایوں کا فرق مٹا کر حق وعدالت کو مدارِ محبت وعداوت ٹھہرایا۔ افراد واشخاص کی محبت کا تابع فرمان رکھا اس وقت تک مسلمان دنیا میں سربلند رہے ہر ایک قوم نے ان کی سچائی کا اعتراف کیا۔ ان کو سراہا۔ لیکن جب سے انہوں نے انفرادیت وخود غرضی کو اپنی محبت کا محور ومرکز ٹھہرا لیا ہے اور حق کو ناحق اور گروہ بندی پر قربان کرنے کی بری خصلت اپنے اندر پیدا کر لی ہے جس میں پڑھا لکھا طبقہ بہ نسبت ان پڑھ طبقہ کے زیادہ مبتلا نظر آتا ہے۔ اس وقت سے ملتِ مسلمہ کی نہ تو شیرازہ بندی ہی کی کوئی صورت باقی رہی ہے اور نہ حق وصداقت کے غلبہ ہی کا کوئی امکان نظر آتا ہے۔

ہم حق وصداقت کے دعوی ضرور کرتے ہیں۔ مگر اپنی جتھہ بندیوں سے اسی کے ساتھ عملاً اپنی ناکامیوں کا ثبوت بھی پیش کرتے ہیں۔ کیا کبھی یہ بھی ممکن ہے کہ ہمیں نامِ حق پیارا ہو اور پھر ہم سے ظلم وناانصافی کا صدور ہو۔ ہم کو یقین وانصاف سے عشق ہو اور پھر عدل ومساوات کی تڑپ ہمارے سینوں کو نہ برمائے۔

رگوں میں دوڑنے پھرنے کے ہم نہیں قائل
جو آنکھ ہی سے نہ ٹپکا تو وہ لہو کیا ہے،

خدا ہمارے لیے پھر کوئی محمد قاسم سا مجدد پیدا کر دے جو تزکیہ وعلم سے ہمارے دلوں کے روگ ضائع کر دے۔ ورنہ بحالاتِ موجودہ تو بکثرت ایسے ہی ہادی و منادی نظر آتے ہیں جن کی زبانیں عربوں جیسی ہیں لیکن ان کے دل عجمیوں جیسے سخت ہیں۔

اب رہ جاتی ہے یہ بحث کہ علم کا کونسا مرتبہ فرضِ عین ہے اور کونسا مرتبہ فرض

کفایہ ہے سو جہاں تک غور و مطالعہ سے کام لیا گیا اصولی طور پر علم کے تین ہی مراتب و درجات نظر آئے جن کی وجہ سے اہلِ علم بھی قدرتی طور پر تین ہی قسم پر مشتمل و منقسم ہو جاتے ہیں۔

ادنیٰ درجہ علم یہ ہے کہ ضروری احکام و فرائض سے واقفیت ہو اور روزمرّہ کے معاملات بیع و شریٰ کے مسائل ہمارے زیرِ نظر رہیں۔

متوسط درجہ علم یہ ہے کہ علومِ اسلامیہ میں اتنی استعداد پیدا ہو جائے کہ ہم قرآن و حدیث کو عربی زبان میں بآسانی سمجھ کر دارسیکھ کر دوسروں کو بھی سمجھانے کی اور سکھلانے کی قدرت حاصل کرلیں اور اس طرح سے تبلیغ دین کا فریضہ ادا کرنے کے قابل بن جائیں۔

اعلیٰ درجہ علم یہ ہے کہ ہم کو غور و تدبر اور غواصی کامل کی وجہ سے دین میں تحقیق و کمال کا مرتبہ حاصل ہو جائے اور ہمارے اندر ایسا تبحرِ علمی پیدا ہو جائے کہ ہم قرآن و سنت کی روح پر مطلع ہو جائیں اور ہمارا علم ایسی محققانہ و مجتہدانہ شان پیدا کرلے کہ اسلام کی حقانیت کو پھر ہم نہ صرف اس کے حلقہ بگوشوں پر واضح کرسکیں بلکہ مخالفینِ اسلام سے بھی اسلام کی حقانیت کا لوہا منوالیں اور اپنے کمال علمی و عملی سے جوہر اخلاق و تقویٰ ہم کو میسر آجائے تاکہ پھر ہمارے جملہ احوال ملت کے لیے قابلِ تقلید و عمل ہو جائیں۔

پہلے درجہ کا علم یعنی فرائض و واجبات و احکام مسائل ضروریہ سے بقدر ضرورت واقفیت بروئے ارشاد نبوی طلب العلم فریضۃ علی کل مسلم و مسلمۃ ہر مسلمان مرد و عورت پر فرض و واجب ہے اس حکم سے کوئی مستثنیٰ نہیں ہے۔

دوسرے درجہ کا علم فرض کفایہ ہے یعنی پوری قوم میں سے اگر دو چار افراد ملت بھی اس درجہ کا علم حاصل کریں تو یہ فریضہ پوری قوم سے ادا ہو جاتا ہے۔

تیسرا درجہ علم ان علمائے ربانی و فضلائے حقانی کے لیے مخصوص ہے جو صحیح معنی میں وارثین حق اور ورثۃ الانبیاء کے لقب کے مستحق ہیں فی الحقیقت انہی کے وجود سے علم نبوت کا بقاء و ارتقاء و احیاء وابستہ ہے۔ اور یہی حضرات درحقیقت عترت کے حقیقی مفہوم و مصداق ہیں اور بحالتِ اختلاف علماء یہی وہ طبقہ اعلیٰ ہے جو قدرتی طور پر بوجہ اپنی علو شان کے علماء کے مابین حکم قرار پا سکتا ہے۔ خدانخواستہ اگر اس طبقہ کے وجود سے دنیا خالی ہو جائے۔ لیکن یہ بھی اسی امت خیر الامم کی خصوصیت ہے کہ یہ امت کبھی بحیثیت مجموعی گمراہی پر جمع نہ ہو گی اور ہر زمانہ میں ایک جماعتِ حقہ ضرور ایسی موجود رہے گی جن کو نہ کسی کا کوئی خلاف ہی مضرت پہنچا سکے گا نہ دنیا کبھی اسے اپنے دامِ فریب سے مسحور و مرعوب کر سکے گی۔

رہا تعلیم جدید اور علومِ عصریہ سے مہارت و واقفیت کا مسئلہ سو اسلام کوئی ایسا تنگ مذہب نہیں کہ فرزندانِ توحید کو دنیوی تعلیم سے منع کرے۔ تعلیم جدید کی طلب معاش اور تلاش فضل کے لیے سخت ضروری ہے۔ نیز اپنی دنیا کو حسین و خوبصورت بنانے کے لیے اس کا حاصل کرنا بھی انتہائی ضروری ہے۔ ہاں تعلیم جدید کے حاصل کرنے کے زمانہ میں یہ خیال ضرور رہنا چاہیے کہ ان کو ان کے مذہب کے خلاف تو کوئی بات نہیں سکھلائی جا رہی ہے۔ تعلیم جدید و قدیم میں جو لوگ تعارض سمجھتے ہیں وہ سخت غلطی پر ہیں۔ ان میں کوئی مخالفت نہیں ہے۔ تعلیم جدید میں اگر کوئی امر خلافِ شرع نہ سکھلایا جاوے تو اس شکل میں تعلیم جدید یقیناً علم دین کی تقویت و تائید کا ذریعہ بن سکتی ہے۔ علم دین مقصد کا درجہ رکھتا ہے جس کی وجہ سے انسان کے دل و دماغ کی تاریکی جہل کافور ہوتی ہے اور ان کی تربیت کے سامان ہوتے ہیں اور دنیوی علوم اسی مقصد کے وسائل ہیں جن

سے انسان اپنا پیٹ پالتا ہے پس اگر کوئی شخص علم دین سے تو پیٹ پالے اور دنیوی
علوم سے دل و دماغ کی تربیت وابستہ کرلے تو یہ دونوں قسم کے اعمال خلافِ فطرت
کہلائیں گے اور ایسے غلط کار لوگوں کو کبھی مقصود حاصل نہ ہوگا ۔

علمِ غیب و علم شہادت :۔

علم کی اصولی طور پر دو قسمیں ہیں :۔
ایک وہ علم جو ہماری عقل اور ہمارے حواس خمسہ کی دسترس سے باہر اور بالاتر ہو ۔
دوسرے وہ علم جو ہمیں بذریعہ عقل و ادراک و وحی حاصل ہو جائے ۔
پس جو علم انسان کو حاصل ہو وہ علم شہادت ہے اور جو مذکورہ بالا ذرائع میں سے کسی
ذریعہ سے بھی حاصل نہ ہو سکے وہ علم غیب ہے ۔ بشر کو غیب کا علم نہیں دیا گیا ۔ ہاں بعض امور
غیبیہ پر اطلاع ضرور دی گئی ہے ۔ سو اطلاعِ غیب اور چیز ہے اور کلیتہً علم غیب اور چیز ہے
قیامت کی اطلاع ضرور دی ہے کہ وہ ایک دن واقع ہوگی ۔ علم بشر کو اس میں دسترس
نہیں دی گئی ہے ۔ بارش کا آنا سب کو معلوم ہوتا ہے لیکن یہ کہ اس کے اترنے کے اسباب
کس سے اکٹھے ہوتے ہیں جس کی وجہ سے وہ اسی وقت برستی ہے ۔ اس کا علم کلی بجز حق
تعالیٰ اور کسی کو نہیں ۔ یا مثلاً یہ تو سب کو معلوم ہوتا ہے کہ فلاں شخص خوش بخت ہے اور فلاں
شخص کم قسمت ہے فلاں شخص کی تقدیر اچھی ہے اور فلاں کی تقدیر بری ہے لیکن فلاں
شخص کا نصیبہ بہتر کیوں ہوا اور فلاں شخص کا نصیبہ بدتر کیوں ہے اس کا علم بجز خدا کے
اور کسی کو نہیں ۔
بعض امورِ غیبیہ کا علم جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کرایا گیا اور دیگر انبیاء علیہم

السلام کے مقابلہ میں حضور کو بہت کثرت سے غیبی اسرار پہ مطلع کیا گیا ۔ لیکن جیسا کہ عرض
کیا جا چکا ہے کہ جب ہمارے احاطۂ علمی میں کوئی چیز آ جائے تو پھر وہ غیب نہیں بلکہ شہادت
ہو جاتی ہے ۔ اس حالت میں باعتبار وقوع کے تو اس کو غیب کہہ سکتے ہیں لیکن باعتبار
علم و اطلاع غیب کے غیب کو غیب نہیں کہہ سکتے ۔ علمِ غیب کلی طور پر حق تعالیٰ ہی کے لیے
ہے اگر اس خصوصیت کو ذات واجب تعالیٰ سے جدا رکھا جاوے تو پھر علم بشر کا بے حد و
بے پایاں ہونا لازم آئے گا جو عقلاً بھی محال ہے ۔ بندہ کا علم ہمارے لحاظ سے خواہ کسی قدر
طویل و عریض و وسیع و عمیق کیوں نہ ہو ۔ لیکن علم الٰہی کے مقابلہ میں اس کو وہ نسبت بھی
نہیں جو قطرہ کو دریا سے ہوتی ہے ۔ اختصاص علمِ غیب کو اگر معاذ اللہ حق تعالیٰ سے جدا
کر دیا جائے تو پھر خدا و غیر خدا میں کوئی فرق باقی نہیں رہ سکے گا ۔ احادیثِ صحیحہ بھی اس کی
مؤید ہیں ۔

چنانچہ مشہور حدیث مشکوٰۃ جس میں جبرئیل علیہ السلام نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے
پاس انسانی شکل میں تشریف لا کر اسلام و ایمان و احسان کے متعلق چند سوالات فرمائے
تھے ۔ ان میں سے ایک سوال قیامت کے متعلق بھی تھا کہ وہ کب واقع ہوگی ۔ آپ
نے اس کے جواب میں ارشاد فرمایا کہ اس کے متعلق جس سے سوال کیا گیا ہے اس کا
سوال کرنیوالے سے زیادہ نہیں اور اس کے بعد آپؐ نے یہ بھی فرمایا کہ سوال ......
ان پانچ باتوں میں سے ایک ہے جنہیں خدا کے سوا کوئی نہیں جانتا ۔
ایمان بالغیب سب اہلِ ایمان پر فرض ہے ۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اول المومنین
ہیں ۔ اس لیے اس کلیہ کی رو سے آپ کو بھی غیب پر ایمان لانا ضروری قرار پاتا ہے جس
سے خود بخود حضور علیہ السلام کے عالم الغیب ہونے کی نفی لازم آتی ہے ۔

حضرات علماء نے زمان و مکان و احکام و تکوینیات وغیرہ کے لحاظ سے علمِ غیب
کی چند قسمیں کی ہیں اور بعض اقسام کو حضور علیہ السلام کے لیے مانا ہے۔ چنانچہ بسلسلہ
جسمانی آپ نے بہت سے غیبی امور کا مشاہدہ بھی فرمایا ہے جو آپ کی جلالت قدر کی
دلیل ہے لیکن جیسا کہ عرض کیا گیا۔ غیب کا علمِ کلی صرف حق تعالیٰ ہی کے ساتھ مختص
وہ خدا کے سوا اور کسی کو سزاوار نہیں ہو سکتا۔ زیادہ تفصیل کا موقع نہیں ورنہ بموقع
نبوی رویتِ باری سے غیب کا جو شبہ قوی ہوتا ہے اس کا بھی جواب عرض کیا جاتا۔ ایک
بادشاہ کے مقربین کی حاضر باشی سے یہ لازم نہیں آتا کہ جس قدر امورِ مملکت اس کے قل
میں چھپے ہوئے ہیں وہ سب کے سب مقربانِ دربار پہ واضح ہو جائیں۔ باوجود تقرب کے
پھر بھی بعض امور ان سے مخفی رہتے ہیں جو منافی تقرب نہیں۔

تقلید و اجتہاد :-

چونکہ علم و عقل کے لحاظ سے انسان مختلف الدرجات ہوتے ہیں جیسا کہ عرض کیا جا
چکا ہے اور دین کی سمجھ ہر ایک شخص کو نہیں ہوتی نہ ہر کس و ناکس کو مسائل شرعیہ میں رائے
زنی کا حق ہی پہنچ سکتا ہے اس لیے انیسواں عقیدہ اہل حق یہ ہے کہ جن فروعی مسائل اور
بے شمار جزئیات میں قرآن و حدیث سے حکم خدا اور رسول واضح طور سے سامنے نہ ہو یا
جن میں روایات کے اختلاف و تعدد کی وجہ سے حق کا تعین دشوار ہو جائے ایسی جگہ
روایات اور ایسے جملہ مسائل و معاملات میں اپنی رائے کو مدارِ کار نہ ٹھہرایا جائے نہ رائے
زنی سے کام ہی لیا جائے بلکہ ایسے تمام امور میں ائمہ اجتہاد کی طرف رجوع کرتے ہوئے
ان میں سے کسی ایک کو اپنا مطاعِ فکر بنا کر ان کی تقلید و اتباع کو واجب و لازم سمجھا جائے

اور ان کے مسلک کی پابندی کی جائے۔ کہ بعد وفات نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ایسے جملہ
نزاعی معاملات میں اللہ و رسول کی طرف رجوع کرنے کی صحیح صورت یہی ہے کہ اللہ کے
رسول سے جن کو جتنا قرب و معیت و صحبت حاصل ہوا اور اصحابِ رسول سے جس قدر
بھی جو بزرگ مسائلِ جزئیہ میں استفادہ فرمانے والے ہیں اسی قدر بعد کے پیدا ہونے
والے ان کے مسلک کی تابعداری کریں۔ جیسا کہ ارشادِ خداوندی فاسئلوا اہل
الذکر ان کنتم لا تعلمون ۰ سے وجوبِ تقلید و رجوعِ اہل علم ظاہر ہے خداوند
عالم فرماتے ہیں کہ اے لوگو! اگر تم کو کسی بات کا علم نہ ہو تو تم اس بات کو حاملانِ قرآن
اور وارثینِ علمِ نبوت سے دریافت کیا کرو یعنی محض اپنی رائے اور قیاس سے کام نہ کیا
کرو۔ اگر ہر شخص کو معاملاتِ دین میں آزاد چھوڑ دیا جاتا اور قرآن و حدیث سے ہر کس
و ناکس کو براہِ راست اخذِ احکام کا حق مل جاتا تو پھر اس دین میں فسادِ عظیم واقع ہو جاتا
اور اس دین کا بھی معاذ اللہ وہی حشر ہوتا جو پہلے ادیان کا ہوا۔ چونکہ قرآن کریم
اصولِ دین کا مجموعہ ہے اور احادیث رسولِ آخر صلی اللہ علیہ وسلم کے مقدس حالات
و احکامات کا مجموعہ ہیں جو فی الحقیقت انہی قرآنی اصول کی علمی و عملی تشریحات ہیں اور
یہ دین سارے کا سارا سماعی ہے۔ یعنی جو کچھ بھی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے حضرات صحابہ
رضوان اللہ علیہم اجمعین نے سنا اس کو انہوں نے واسطہ در واسطہ ہم کو سنایا۔ اور اس
طرح سے دینِ آخر کو محفوظ فرما کر بلا کم و کاست ہم کو پہنچایا۔ اس لیے یہ کلیۃً واجب
التسلیم ہوگا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے سماعت کے لحاظ سے جو مقدس واسطے جس
قدر بھی قربت رکھتے ہیں۔ اسی قدر اور اسی تناسب سے ان کی رائے اور ان کا مسلک
بھی موافقتِ قرآنی کے باعث ہمارے لیے واجب الاتباع ہوگا۔ عہدِ نبوی میں تو

احکام خدا ورسول کی تکمیل کی صورت یہ تھی کہ جو ضرورت پیش آتی تھی سائل بر
خدمتِ نبوی میں حاضر ہو کر شرح صدر کے ساتھ احکام خدا ورسول حاصل کر
لیکن نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد ظاہر ہے کہ یہ صورتِ حال باقی نہ
سکتی تھی اس کے بعد فیصلۂ امور کی صورت یہ ٹھہری کہ قابل حکم مسائل میں حضرا
وخلفائے راشدین نے دیگر اصولی احکامات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیشِ نظر
قوت فیصلہ و اجتہاد سے کام لے کر نظمِ خلافت و نظم شریعت کو قائم فرمایا لیکن جب
طریقوں سے مختلف علمی وعملی عقلی ونقلی فتنوں نے سر اٹھانا شروع کیا اور چہرہ پر ا
خد وخال مشتبہ ہو جانے کا خطرہ ان بزرگ وارثوں کے سامنے آیا تو انہوں نے بکما
بازی و بہی خواہی امت پہلا کام یہ کیا کہ جملہ کاتبانِ وحی سے قرآن شریف کی یکجائی کر
کرا کر اس کو ہمیشہ کے لیے محفوظ کرا دیا اور ہمارے نسلاً بعد نسل و قرناً بعد قرن اس کو
وسالم حالت میں منتقل کرنے کا سامان فرما کر خدا کے ذکر کی حفاظت کا عظیم ترین
شرف حاصل کیا۔ حضراتِ صحابہ کا امت پر یہ وہ عظیم الشان احسان ہے جس سے احسا
شناس لوگ قیامت تک سر نہیں اٹھا سکتے اسی طرح جب روایات نبوت سے اصا
اغراض نے ناجائز فوائد حاصل کرنا چاہے تو مابعد کے فیض یافتہ حضرات نے صحابہ
نقش قدم پہ چلتے ہوئے احادیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو محفوظ کیا اور رجال
حدیث کی ثقاہت و عدالت کی پوری چھان بین کرتے ہوئے احادیثِ رسول کے ا
اور اصول منضبط کیے۔ یہ دوسرا احسان بھی اسی قسم کا امت مسلمہ پہ ہوا۔ ورنہ بہت
ممکن تھا کہ احادیث واحکام رسول سے بھی اہل غرض دین کو اپنی اغراضِ فاسدہ کا نشا
بنا سکتے۔

اسی طرح سے تیسرا احسانِ عظیم حضرت امام اعظم ابوحنیفہ رح اور ان کے دیگر رفقاء کرام
کا امت پر ہے جنہوں نے قرآن وحدیثِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو حضرات صحابہ کے
تبعین سے حاصل کر کے علمِ فقہ کی بنیاد ڈالی اور اجماع صحابہ و قیاس خلفاء راشدین کو مشعلِ
راہ بنا کر اور حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کے نقش قدم پر چل کر خوشنودی خدا ورسول
حاصل کرنے کے لیے تفقہ فی الدین کا سامان فرماتے ہوئے احکام فقہیہ کو اپنے موقعہ
محل سے پیش کیا۔ نیز قرآن، سنت، اجماعِ امت اور قیاسِ صحابہ ہر حکم شریعت علیحدہ
علیحدہ نکھار کر پیش کیا۔ بہ نظرِ انصاف دیکھا جائے تو یہ حق عند اللہ والناس انہی اکابرِ
امت رحمہم اللہ کا تھا کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے پیشین گوئی فرمائی تھی خیر القرون
قرنی ثم الذین یلونھم ثم الذین یلونھم۔ بہترین زمانہ میرا زمانہ ہے
یعنی جس میں ہر ایک سائل کو براہِ راست مجھ سے احکامات حاصل کرنے کا موقع میسر
ہے اس کے بعد دوسرے درجہ میں بہتر سے دور حضور کے صحابہ کا تھا جنہوں نے جو
کچھ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا تھا وہ اپنے متبعین کو پہنچایا
حقیقت یہ ہے کہ وفاتِ نبوی کے بعد پیدا ہونے والوں کے لیے اس سے بڑھ
کر کیا سعادت ہو سکتی تھی کہ انہوں نے حضرات صحابہ سے اپنے کانوں سے یہ پیارے الفاظ
سنے کہ ہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ سنا اور ہم سے حضور نے فلاں ارشاد فرمایا۔
تیسرے درجہ میں بہتر دور حضراتِ تابعین و متبعین صحابہ کا تھا کہ جن کے اور حضور
کے درمیان میں صرف حضرات صحابہ ہی کا ایک واسطہ تھا۔ اثر نبوت انہی تین زمانوں
میں چودھویں پندرھویں اور سولھویں رات کے چاند کی طرح چمکتا رہا لیکن اس کے بعد
بھی اس کی نورانیت قدرتاً اس درجہ پر رہی۔

حضرت امام ابو حنیفہؒ تابعین میں سے ہیں۔ تابعی اسے کہتے ہیں جس نـ
صحابہ کی زیارت کی ہو۔ یہ آپ ہی کی قسمت تھی کہ جن مبارک آنکھوں نے
اللہ علیہ وسلم کے دیدار مبارک سے اپنی آنکھیں روشن فرمائی تھیں۔ امام اعظمؒ
دیکھا۔ امام اعظمؒ کو اس پر ناز تھا کہ انہوں نے حضرت انس رضی اللہ عنہ کی زیار
ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب کبار میں سے تھے اور ان کو خادم
کا شرف حاصل تھا۔ اس طرح بلاشبہ امام اعظم بھی باعتبار اپنی مجد و شرف کے ثمر
ملونھم کے دوسرے مرتبہ میں شامل ہے حضرت امام شافعی علیہ الرحمۃ امام اعظ
قدر کی نسبت فرمایا کرتے تھے۔

الناس کلھم عیال ابی حنیفۃ فی الفقہ ۔	تمام آدمی فقہ میں امام ابو حنیفہؒ ک ہیں ۔

پس یہ ہے کہ تقلید و اتباعِ ائمہ مجتہدین حفاظتِ دین کا بہت ہی اہم ذرای
خوب سمجھ لو : مسائل و احکام دین کی بنیادیں چار ہیں ؛ قرآن، سنتِ رسول اللہ
اجماعِ امت، قیاس حاکم و مجتہدانہ از قرآن و سنت ۔

قرآن کریم و سنت رسول اللہ کا قطعی الثبوت اور واجب العمل ہونا محتاجِ تش
نہیں۔ اجماعِ امت کی ضرورت متعدد ارشادات نبوت سے واضح ہے حدیث میں

(عن ابی ذر قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من فارق الجماعۃ شبرا فقد خلع ربقۃ الاسلام من عنقہ رواہ احمد وابوداؤد (مشکوۃ)	حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرمایا کہ جو مسلمان جماعت حقہ سے بالشت بھی جدا ہو گیا تو بس یہ سمجھ لو

	اس نے نتائجِ مابعد کے لحاظ سے اسلام کا حلقہ اپنی گردن سے اتار پھینکا ۔

اس حدیث سے اجماعِ ملت و اجماعِ امت کی شرکت اور اس کے اتباع ن
ت روزِ روشن کی طرح سے عیاں ہے ویسے بھی جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ
پنی حیاتِ طیبہ میں ہمیشہ حضرات صحابہؓ سے مہماتِ دینی و علمی میں مشورہ فرماتے
چنانچہ اذان وغیرہ کے بارے میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا مشورہ قبول فرمانا
یثِ صحیحہ سے ثابت ہے۔ اجماعِ امت دین کا بڑا استون ہے جو جماعت کی شکل
یں ہمیشہ نمودار ہوا ہے۔ بال سے زیادہ باریک کوئی چیز نہیں ہوتی اسے ہر شخص
توڑ سکتا ہے لیکن جب بہت سے بالوں کو بانٹ کر ان سے رسی بنالی جاتی ہے تو
رے سے بھی نہیں ٹوٹتی۔ اسی طرح سے جب ایک شخص کی رائے دوسرے سے مل
ہے تو پھر قوت پکڑتی جاتی ہے۔ حدیث میں ہے ۔

وا السواد الاعظم الخ	ملت کے سوادِ اعظم کا اتباع یعنی ملت کے باکمال متدین علماء و حکماء کی اجتماعی ہیئت کو تسلیم کرو ۔

اسی لیے جماعت اور سوادِ اعظم سے کٹ جانے والے کے لیے جہنم کا ٹھکانہ فرمایا
ہے۔ ہاں مگر سوادِ اعظم میں اہل حق و اہل دیانت کا غلبہ شرطِ اولیں ہے اگر یہ شرط نہ ہو
اس کو سوادِ اعظم بھی نہیں کہہ سکتے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جماعت کی اہمیت
علق ارشاد فرمایا ہے ۔

اللہ علی الجماعۃ ۔	جماعت کے اوپر اللہ کا ہاتھ ہے ۔

ایک ارشاد یہ ہے

لا تجتمع امتی علی الضلالۃ

میری امت بحیثیت
گمراہی پر جمع نہ ہوگی۔

اور واقعۃً قرآن وسنت واجماع امت وقیاس مجتہدین وغیرہ
امت گمراہ ہو بھی کیسے سکتی ہے ویسے بھی یہ امت خیر الانام خیر اُمت کر
فرمائی گئی ہے۔

رہا سوادِ اعظم یا حاکمانِ امت ورہنمایانِ اسلام کا قیاس سو یہ بھی
سمجھا گیا ہے جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ فاعتبروا یا اولی الابصا
ہے۔ عبرت پکڑنا اور کسی واقعہ میں فکر ونظر کر کے اس سے استدلال کرنا
حدیث میں ہے کہ جب حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے معاذ بن جبل کو قا
یمن بھیجا تو آپ نے پوچھا کہ اے معاذ تم لوگوں کے اختلافی معاملات کیسے
عرض کیا یا رسول اللہ کتاب اللہ سے فیصلہ کروں گا حضرتؐ نے فرمایا اگر
کتاب اللہ میں نہ ملے تو کیا کرو گے۔ عرض کیا کہ پھر سنتِ رسول اللہ سے فیصلہ
فرمایا اس میں بھی نہ ملا تو کیا کرو گے عرض کیا پھر اپنی رائے سے اجتہاد کروں گا
نے حق تعالیٰ کا شکر ادا فرمایا اور اس ذکر کردہ طریقہ کو موفق ومحبوب عند اللہ

اس حدیث سے ضرورت وتحسین قیاس اور تدوین قواعدِ فقہیہ کی تمنا ک
درجہ رہنمائی ہوتی ہے وہ ہر ایک انصاف پسند پر روشن ہے۔ یہی وہ تمنا
تھی جسے حضرت امام اعظمؒ اور ان کے بعد ان سے دیگر شاگردانِ رشید و
کرام نے بصورتِ تدوین فن فقہ وعقائد وکلام پورا کیا۔ ابتدائے اسلام

تک خلافت راشدہ کا نظام قائم رہا تو مہماتِ امور میں خلفائے راشدین اور اجلۂ صحابہ
قیاس اجماع سے کام لیتے رہے جو حضراتِ صحابہ مجتہدانہ شان رکھتے تھے وہ مجتہد
صحابہ سے مسائل میں رجوع فرما لیتے تھے لیکن جب شیرازہ خلافت راشدہ بکھر اتو حضرات
صحابہ کے بعد یہ درجہ اجتہاد وتفقہ حق تعالیٰ نے حضرت امام ابو حنیفہ وامام شافعی
وامام احمد بن حنبل رحمہم اللہ کو بخشا ان حضرات نے دین کی تفصیلات کو بعینہٖ اسی طرح
مدوّن کیا جیسے اس متمدّن دور میں ہائی کورٹ کے بڑے بڑے ججوں کے فیصلوں کے
معہٗ ان کے نظائر وشواہد کے بڑی بڑی ضخیم جلدوں میں ہر سال مرتب کر کے وکلاء
کی بصیرت کے لیے پیش کیا جاتا ہے جن کو ہر جگہ تسلیم کیا جاتا ہے۔ حالانکہ بعض اوقات
نظائرِ مدوّنہ میں باہم کافی فرق اور تضاد بھی ہوتا ہے۔
بہر حال جو درجہ اجتہاد کا اجمالاً حضراتِ صحابہ کو حاصل تھا وہ نازل مرتبہ میں تفصیلی
طور پر انہی مذکورہ بالا ائمہ اربعہ کو حاصل ہوا۔ جیسے احادیثِ صحیحہ کی جمع وتحقیق کے سلسلہ
میں ہم حافظانِ حدیث کے رہینِ منت ہیں اور ان کے مسلمہ رواۃ کو ہم مستند جان کر ان کی
اقتدا کرنے پر مجبور ہیں اسی طرح تفقہ فی الدین کے سلسلہ میں ہم امام ابی حنیفہ ودیگر ائمہ کرام
کے بھی خوشہ چین۔

پس ائمہ احادیث رحمہم اللہ کی اتباع وتقلید کرنا اور ائمہ فقہ کو برا بھلا کہنا میرے
خیال میں دنیائے مسائل واحکام میں ایک قسم کا الجھاؤ پیدا کرنا ہے اسی لیے جو لوگ فقہ
وحدیث دونوں کے ائمہ کو قابلِ اعتبار ولائق اتباع سمجھتے ہیں وہ ہمارے نزدیک ما
انا علیہ واصحابی کے راستے پر گامزن ہیں اور جو اس راہ سے ہٹے ہوئے ہیں وہ اپنے
دین میں خود آرائی وخود پسندی لیے ہوئے ہیں پھر جب کہ خداوند عالم نے ہماری مختلف

مصلحتوں کے پیش نظر حسب آیت کریمہ :-

یاایها الذین آمنوا اطیعوا اللہ واطیعوا الرسول واولی الامر منکم

اے ایمان والو! اللہ اور اس کے ر... کی اطاعت کرو اور اپنے حکمرانو... کہا مانو .

میں نہ صرف ہم کو اپنی اور اپنے رسول ہی کی اطاعت کا حکم دیا ہے بلکہ اولی
کی ایک تیسری اطاعت بھی اس کے ساتھ ہمارے اوپر واجب ٹھہرائی ہے جس کے
میں جملہ مسلم قضاۃ عادل حکام وولات باایمان ومجتہدین اولوالابصار سب داخل
شامل ہیں . تو اس کے بعد کس کو یہ حق پہنچتا ہے کہ وہ ان ہر سہ اطاعتوں سے اپنی گر
چھڑا سکے . سب جانتے ہیں کہ حضرات صحابہ کی امتیازی شان سمعنا و اطعنا
تھی یعنی انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانِ مبارک سے جو حکم بھی سنا اس کو
بسروچشم قبول کر کے اس کی تعمیل کی ہے اور مقابلینِ حق کی شان ان کے بالمقابل سمعنا
وعصینا تھی . یعنی جو سنا اسی کا خلاف کیا . پس حضراتِ صحابہ کی یہ سمع وطاعت جو دین
کا بنیادی اصول ہے سلفاً عن خلفٍ اور قرناً بعد قرنٍ ونسلاً بعد نسلٍ اسی طرح سے ہمارے
اندر منتقل ہوتی رہنی چاہیئے جس طرح سے شجر انسانی میں ہر ایک ظاہر ہونے والا اپنے نا
کی تقلید واتباع کو اپنے ساتھ لیے دنیا میں آتا ہے اسی کا نام تقلید ہے . اور فی الحقیقت
یہی تقلید صالح ہمارے دین کی حفاظت کی واحد ضمانت ہے اگر ہم کو ہمارے افکار پر چھوڑ
دیا جاتا تو خدا جانے آج ہم میں سے کون کہاں ہوتا . معلوم ہوا کہ اجتہاد مطلق کا درجہ تو
انہی اکابر ملت کو حاصل ہونا چاہیئے تھا جو حضورؐ کے زمانہ مبارک سے قریب تر ہوں
چنانچہ انشاء اللہ ائمہ اربعہ کا یہ اجتہادِ مطلق قیامت سلفاً عن خلفٍ ہمارے لیے شمع

پابند رہے گا . لیکن اب اجتہاد کا حق ان کبار علماء کو بحیثیت اجتماعی حاصل ہے جن
کی نظر قرآن وسنت کی گہرائیوں میں پہنچتی ہو اور جن کو کمال علم وعقل کے ساتھ کمال تدین
وتقوی اور تجاربِ کثیرہ بھی حاصل ہوں .

مجتہد کا کام یہ ہے کہ وہ کسی ایسے مسئلہ کو جس کی اصل بظاہر احکام شریعت میں
واضح نہ بنتی ہو اس کی اصل کا کھوج لگا کر اس کا وہی حکم بتلائے
جو قرآن وسنت سے ثابت ہو . مثلاً اس پر امت کا اجماع ہے کہ اگر کوئی شخص اپنی
مملوکہ لونڈی سے صحبت کرے تو اس کی ماں سے اس شخص کو صحبت کرنا حرام ہو جاتا
ہے . امام ابو حنیفہؒ نے اس سے یہ قیاس فرمایا کہ اگر کوئی شخص کسی عورت سے زنا کرے
تو اس شخص کو بھی زانیہ کی ماں سے اسی طرح صحبت کرنا حرام ہو گی یا مثلاً قرآنِ کریم میں
شراب کی حرمت مذکور ہوئی ہے . تاڑی اور بھنگ اور افیون کی حرمت کی تصریح نہیں ہے
قیاس شرعی یہ ہے کہ نشہ جو علتِ حرمت ہے وہ ان میں بھی موجود ہے لہذا بسبب اشتراک
علت ان کو بھی حرام ہونا چاہیئے . بس مجتہد کا یہی کام ہوتا ہے کہ وہ ایسے کام تبلائے .
فرض کرو کسی ملک میں ان کے علاوہ کوئی پھل یا درخت ایسا پایا جائے کہ اس میں نشہ ہو
تو اس ملک کے علماء کو بھی اپنے ملک میں یہ حق اجتہاد حاصل ہوگا کہ وہ اس پھل اور درخت
کو بھی شراب کے حکم میں لاکر ممنوع قرار دیں .

شاید آپ کو اس موقعہ پر یہ خیال گذرے کہ آخر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس
ضرورت اجتہاد کا خیال کیوں نہ فرمایا اور آپ نے عہد میں تفصیلی احکام کو مدون کیوں نہ کرایا
اس کے متعلق یہ عرض ہے کہ تیس برس کی قلیل مدت میں جو عالم گیر اصلاح کے سامان ہوئے
انہوں نے ایسی تفصیلات میں جانے کا خاطر خواہ موقعہ ہی نہ دیا . لیکن اس کے باوجود

اجتہاد کی داغ بیل خود آپ کے صحابہ نے ڈالی جیسا کہ ہم گذشتہ صفحات میں حدیث
معاذ بن جبل نقل کر چکے ہیں جو ہمارے اثبات مدعی کے لیے کافی ہے لیکن اب ہم ناظرین
کی مزید تسلی کے لیے اس سے بھی زیادہ صاف اور واضح ایک اور حدیث صحیح نقل کرتے
ہیں۔ بخاری ومسلم میں ہے۔

اذا حکم الحاکم فاجتہد فاصاب
فله اجران واذا حکم فاجتہد
فاخطا فله اجر واحد (حاکم)

جب اپنے اجتہاد سے کوئی فیصلہ کرے
اور فیصلہ واقع میں درست ہو تو اس
کے واسطے دوہرا ثواب ہے اور اگر
اس میں نیک نیتی کے ساتھ خطا ہو جائے
تو اکہرا ثواب ہے۔

ہمارے ائمہ مجتہدین اور نظامِ خلافت کے علم بردار دونوں فی الحقیقت دین
کے حاکم ہی تھے اور منصب اجتہاد کے حقدار تھے چونکہ اس زمانہ میں خود رائی وخود
پسندی اعجاب رائے اور انانیت کا مرض عام ہو گیا ہے اس لیے . . . . اس دور
میں تو تقلید صالح بہت ہی زیادہ ضروری ہے ان لوگوں کو تقلید یوں بھی شاق نہیں
گزرنی چاہیے کہ امام بخاری۔ ترمذی۔ ابوداؤد جیسے جلیل القدر ائمہ احادیث بھی مقلد
ہی تھے اور ایک ہزار سال میں نہ معلوم کتنے لاکھ اور کروڑ علماء وصلحاء مقلد ہوئے ہیں۔
ان سب کا ایک ہی حقیقت پر جمع ہونا بتلا رہا ہے کہ تقلید شخصی حق اور ثواب ہے
باقی تقلید میں بعض غلو کرنے والے علماء نے یہ جو وطیرہ اختیار کر لیا ہے کہ وہ صحیح حدیث
کے مقابلہ میں اقوال مجتہدین کو بطور حجت پیش کر کے اسی پر عمل کرتے ہیں اور فقہ
سے حدیث کو اور حدیث سے قرآن کو منسوخ کرتے ہیں یہ طریقہ اہل حق کا ہرگز نہیں

ابوالاعلیٰ صاحب مودودی کا یہ نظریہ درست ہے کہ ہمارے لیے سوائے
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قول وفعل کے کسی کا قول وفعل حجت نہیں ہے
اس کے صاف معنی یہ ہیں کہ وہ اجماعِ امت اور قیاس صحابہ سے منکر ہیں۔ حالانکہ پوری
امت اجماع وقیاس کو اصول دین جانتی ہے افراط وتفریط جہاں بھی ہو جس صورت
میں بھی ہو اسلام ان سے انکار کرتا ہے تجربہ شاہد ہے کہ جو کم علم لوگ تقلید مجتہدین
سے روگردانی کرتے ہیں وہ صحیح مسلک کھو بیٹھے ہیں اور پھر انکار فقہ وحدیث
کا شکار ہو جاتے ہیں۔ اس عرض مدعا سے یہ مطلب نہ لیا جائے کہ میں تقلید شخصی
پر زور دے کر قوم کو کمالِ علمی سے محروم کرنا چاہتا ہوں۔ میرے نزدیک کمال علم
میں تقلید شخصی ہرگز خارج نہیں ہے بلکہ غور کیجیے تو اتباع اسلاف ہی تمام کمالات
کی اصل ہے۔

مجتہدین کے متعدد طبقات ہیں جن کے ذکر وبیان کا یہاں موقع نہیں ہے
صرف امام ابوحنیفہؒ کے شاگردان خاص کے نام ذکر کیے جاتے ہیں۔ ان کے اسمائے
یہ ہیں۔ امام ابویوسفؒ امام محمدؒ، امام زفرؒ، امام زفر مجتہد بھی تھے متعدد مسائل میں
صاحبین کا اختلاف بھی امام اعظم سے کتبِ فقہ میں منقول ہے جو فی الحقیقت
اختلاف امتی رحمۃ کی صحیح عملی ہے امام ابوحنیفہؒ کے مسلک کے اختیار کرنے
والوں کو حنفی اور مالک کے مقلدوں کو مالکی اور شافعی کے مقلدوں کو شافعی اور
امام احمد بن حنبل کے ماننے والوں کو حنبلی کہا جاتا ہے۔ بہ نظرِ انصاف دیکھا جائے

تو ائمہ اربعہ کا امت پر بہت بڑا احسان ہے۔ ان حضرات نے اپنی علمی کاو
اپنے بعد کے محققین اور صاحبان فتویٰ کے لیے بڑی بڑی آسانیاں پ
ہیں۔ آج کے علماء کرام بھی اگر وقت کے تقاضوں کو پہچان کر انہی حضرات
نقش قدم پر چل کر فقہ کو لباس جدید پہنانے کی طرف متوجہ ہوں اور
کی ایک معتبر جماعت فقہ کی جدید ترتیب و تبویب فرما کر ان مسائل پر
ومباحثہ کے بعد جو علوم عصریہ کی وجہ سے محتاج حکم ہو گئے ہیں اپنا
فیصلہ صادر کرے جیسے مثلاً رویتِ ہلال کی اطلاع ریڈیو کے ذریعہ
قابلِ اعتماد علماء کی منظوری سے دی جا سکتی ہے یا نہیں تو یہ ہے کہ
ایک اہم خدمت ہو گی جن سے ائمہ مرحومین کی ارواح طیبہ مسرور ہونگی

سنت و بدعت :-

بیسواں عقیدہ اہل حق یہ ہے کہ ہم اپنے جملہ حالات و معاملات میں
محمدی و طریقہ اصحابِ رسالت کو اپنا محور فکر و عمل بناتے ہوئے ان کی پیر
کو اپنا مقصد زندگی ٹھہرائیں۔ نیز احکام شرعیہ و مسائلِ دینیہ میں اپنی طرف
کوئی نئی بات ایجاد نہ کریں جس سے چہرۂ دین مشتبہ ہو جائے اور غیر دین
و مذہب معلوم ہونے لگے۔ دین میں کوئی ایسا نیا کام کرنا یا کوئی نیا حکم جار
کرنا جو شریع یا اہلِ شرع سے ثابت نہ ہو تو اس کو بدعت کہتے ہیں۔ حدیث
میں ہے۔

من احدث فی امرنا فھو رد

جو شخص ہمارے دین میں کوئی نیا

کام کرے وہ مردود ہے۔

مثلاً عید کا خطبہ جو نماز عید کے بعد دیا جانا احادیث صحیحہ سے ثابت ہے
اگر کوئی امام اسی ثابت شدہ خطبہ کو نماز عید سے پہلے دینے لگے تو اس شکل
میں یہی سنت بدعت ہو جائے گی کیونکہ اس بدعتی امام نے اس عمل رسول کو
اس کو اصلی موقعہ و محل سے بدل کر اپنی رائے سے جدید موقعہ و محل میں کرنا شروع
کیا ہے۔ غرض جو باتیں کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ و سنت اصحاب وغیرہ
سے ثابت نہ ہوں اگر ایسے امور کو بلا کسی شرعی ضرورت کے بطور ایجاد بندہ کیا
جائے تو ان کو یقیناً امر محدث و بدعت کہا جائے گا ہاں جو امور بوجہ ضرورت
شرعیہ اصحاب اجتہاد کی طرف سے باوجود کلام اللہ و سنت رسول سے ثابت
نہ ہونے کے فرمائی جائیں وہ بدعت کی تعریف میں داخل نہیں ہوں گی یہ ایسا ہی
ہے جیسے ایک عامی شخص اگر کسی دوسرے آدمی کو جان سے مار ڈالے تو اس کو بطور
قصاص قتل کیا جانا ضروری ہو جاتا ہے اور اسی شخص کے لیے اگر قاضی شرع اور حاکم
وقت قتل کا حکم دیدے تو اس کو الٹا ثواب ملتا ہے حالانکہ جان لینے میں دونوں برابر
ہوتے ہیں مگر مجاز و مختار چونکہ ہر ایک نہیں ہوتا اسی لیے ایک خدا کے یہاں مردود
ہوتا ہے اور دوسرا اسی فعل سے مقبول ٹھہرتا ہے۔

اس کو مثال میں سمجھیے۔ قرآن کریم حضورؐ کے وقت میں حضرات صحابہ کے سینوں
میں محفوظ تھا حضورؐ کے بعد کی جنگوں میں جب اکثر حفاظِ قرآن شہید ہو گئے تو
حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو فکر ہوا کہ کہیں قرآن کریم دنیا سے معدوم نہ ہو جائے آپ
نے حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کو اس طرف متوجہ کیا۔ ابتداً حضرت صدیق اکبر کو

یہ تامل ہوا کہ جو کام حضورؐ نے نہیں کیا وہ میں کیسے کروں لیکن جب اس اہم ضرورت پر اللہ کی جانب سے حضرت صدیق اکبر کا سینہ کھول دیا گیا تو آپ نے قرآن کریم کے اجزا کو حفاظِ قرآن سے یک جا کر کے ایک قرآن کریم مرتب فرما کر حضرتِ حفصہ کے پاس محفوظ کرا دیا۔ حضرت عثمان ذی النورین کے دورِ خلافت میں جب قرآن کریم کے پڑھنے میں اختلافِ قراءت بڑھنے لگا تو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو بہت فکر ہوا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ جس طرح سے سابقہ امتوں نے اپنے انبیاء کی وحی کو مختلف فیہ بنا دیا ہے۔ رسول آخر کی وحی میں بھی خدانخواستہ یہی صورت نہ پیدا ہو جائے اس لیے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے وقت کا مرتبہ کلام پاک منگوا کر جملہ کاتبانِ وحی کے مشورہ و اعانت سے اصل قراءت کو ہمیشہ کے لیے محفوظ کرا دیا۔ پس جمع قرآن کی یہ عظیم الشان اور بنیادی خدمت گو حضور علیہ السلام کے بعد ہوئی لیکن بروئے آیت کریمہ ان علینا جمعہ وقرانہ قرآن کریم کی جمع و ترتیب کا اہم کام بدعت نہیں کہا جائے گا بلکہ انا نحن نزلنا الذکر وانا لہ لحافظون کی صداقت کا اس کو ایک کھلا ہوا ثبوت کہا جائے گا۔

حجۃ الاسلام جد امجد حضرتِ نانوتوی قدس سرہٗ نے بدعت و غیر بدعت کے فرق کو ایک مثال سے واضح فرمایا ہے مناسب ہے کہ اس جگہ اس تحقیق لطیف کے ایک حصہ کو نقل کیا جائے۔ اجوبۃ الکاملہ میں حضرتؒ تحریر فرماتے ہیں۔

جو باتیں کلام اللہ اور احادیث سے ثابت نہ ہوں پھر ان کو بے ضرورت شرعیہ ثواب سمجھ کر کرے تو وہ باتیں من جملہ بدعات ہوں گی۔ باقی وہ چیزیں جو بوجہ ضرورت

شرعیہ باوجودیکہ کلام اللہ اور حدیث میں نہیں ہوتی موجب ثواب ہوتی ہیں تفصیل ان کی مکمل نہیں ہاں ایک نظیر مدنظر ہے اس کو بغور سنیے کہ توپ و بندوق سے جہاد کرنا دین کی کتابوں میں نہیں یہ جملہ اشیاء فراہم کرنا عین دین کا کام کرنا ہے یعنی یہ چیزیں باہر چند کتاب اللہ وسنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت نہیں مگر ان کی مثال ایسی ہے جیسے طبیب نسخہ میں دو تولہ شربت بنفشہ مثلاً لکھے اور بیمار کسی سے شربت بنفشہ کی ترکیب دریافت کر کے دوائیں جمع کرے مٹھائی لائے چولہا بنائے، آگ جلائے قوام پکائے شربت بنفشہ بنائے۔ ہر چند اتنے بکھیڑے کی نسخہ میں تشریح نہ تھی مگر بایں نظر کہ شربت بنفشہ بے ان بکھیڑوں کے حاصل ہو نہیں سکتا ناچار کرنا پڑے گا اور اس بکھیڑے کا کرنا امتثال امر طبیب سمجھا جائے گا جو موجبِ خوشنودی طبیب ہوگا سو جیسے طبیب نے نسخہ میں دو تولہ شربت بنفشہ ہی لکھا تھا اور اس جھگڑے کا اصلاً ذکر نہ تھا اور بایں ہمہ اس کا کرنا باعث ناخوشی نہیں بلکہ اگر شربت بنفشہ تیار نہ ملے تو اس جھگڑے کا نہ کرنا البتہ موجب ناخوشی ہوگا۔ ایسا ہی تصنیفِ کتب اور آلات مذکور کا ہر چند کتاب اللہ اور احادیث نبوی میں کہیں صراحتاً ذکر نہیں، پر بایں نظر کہ جہاد اور علم اس زمانہ میں ان دونوں پر موقوف ہیں تو اس کا کرنا موجبِ ناخوشی نہ ہوگا بلکہ نہ کرنا موجب نارضامندی خداوند ذوالجلال و رسول باکمال صلی اللہ علیہ وسلم ہوگا۔ ہاں اگر ایسی کمی بیشی ہو جیسی طبیب نے دوائیں لکھی تھیں یہ اس میں اپنی رائے سے ایک دوا اور بڑھا دے یا گھٹا دے یا اوزانِ ادویہ میں اپنی رائے سے کمی بیشی کر دے جن تصرفات سے طبیب ناخوش ہو جائے اللہ جل شانہٗ اور رسول اللہ صلی اللہ

علیہ وسلم بھی ایسے تصرفات سے ناخوش ہوگے۔

ان کی مثال ایسی ہے جیسے فرائض خمسہ چار کر دیجئے یا چھ کر دیجئے یا اعداد رکعات میں تصرفات کر کے دخل دیجئے۔ انتہیٰ۔

حضرتؒ کی اس تقریر سے واضح ہوتا ہے کہ جس چیز کا منشا، کلام اللہ حدیثِ رسول اللہ اجماعِ امت اور قیاس سے نکلتا ہوا ایسے امور کی تفصیل و توضیح اور ان کی عملی صورت کسی وقت بھی بدعت نہ کہلائے گی۔ جس چیز کا منشا ہی سرے سے موجود نہ ہو اور کوئی ضرورتِ شرعیہ بھی اس چیز سے وابستہ نہ ہو بے شک وہ بدعت کی تعریف میں آئے گی۔ آجکل مسلمانوں نے دین میں طرح طرح کی ایجادیں کرنا شروع کر دی ہیں۔ چنانچہ بعض علاقوں کی اکثر مساجد میں دیکھنے کا اتفاق ہوا کہ نماز جمعہ سے فارغ ہو کر دعا مانگنے کے بعد دوسری دعا کے انتظار میں سب لوگ بیٹھے رہتے ہیں چنانچہ جب سنتوں وغیرہ سے فارغ ہو لیتے ہیں تو دوبارہ امام دعا کے لیے ہاتھ اٹھاتا ہے۔ یہ دوسری مرتبہ کی دعا اس وضع و طریق سے احادیث صحیح سے کہیں ثابت نہیں ہے اسی طرح سے بہت سی بدعات و مخترعات ایجاد ہوتی جاتی ہیں۔ مسلمانوں کو چاہیے کہ جو امور سلف سے ثابت نہیں ان کو ہرگز نہ کریں نہ انہیں دین سمجھیں۔

تہذیب اخلاق :

اکیسواں عقیدہ اخلاق کی درستی ہے جو انسان پر واجب ہے جب تک انسان کے اخلاق درست نہیں ہوتے اس وقت تک وہ نام کا آدمی ضرور

... ہے مگر حقیقۃً جانوروں سے بھی کمتر ہوتا ہے اخلاق کی اصلاح کے لیے صحبت ... اہل کمال اشد ضروری ہے تعلیم بھی اسی وقت پورا فائدہ پہنچاتی ہے جب ... کاملین نصیب ہو حدیث میں ہے۔

تخلقوا باخلاق اللہ ... اللہ کے اخلاق حمیدہ جیسے اپنے اندر اخلاق پیدا کرو۔

جس طرح سے تم اپنے نفس کو بھوک اور پیاس سے نجات دلانا ضروری سمجھتے ... اسی طرح سے اپنے نفس کو کمالات کی غذائیں بھی دینا ضروری سمجھو اور رذائل سے ... اوصاف کرنا بھی ضروری تصور کرو خواہشاتِ انسانی اور اس کی رغبتیں بیشمار ... جن کے لیے کوئی حد معین نہیں کی جاسکتی۔ ہاں اصولی طور پر صرف یہی کہا جا ... سکتا ہے کہ اسلام نے نہ ہمیں نفس کے بارے میں ایسا سخت گیر بنایا ہے کہ ہم اس ... کی جائز خواہشات اور رغبتوں سے بھی اسے محروم کر دیں جیسا کہ ولنفسك ... علیك حق سے واضح ہے اور نہ اس نے نفس کو ایسا مطلق العنان دیکھنا پسند ... کیا ہے کہ وہ اللہ کی مقرر کردہ حدوں کو توڑ کر ان سے باہر نکل جائے کسی انسان ... کا بندۂ حرص و ہوا بن جانا اور انفرادیت و خود غرضی میں سدا غرق رہنا بدترین ... بداخلاقی ہے اور باہم ایک دوسرے کے کام آنا آپس میں اتفاق و اتحاد رکھنا ... خوش اخلاقی ہے۔ حدیث میں ہے۔

”تم ہرگز جنت میں داخل نہیں ہو سکتے جب تک مومن نہ ہو اور تم ہرگز مومن نہیں ہو سکتے جب تک باہم محبت نہ کرو۔“

پس جو لوگ اسلام کے مدعی ہیں مگر وہ ہمیشہ اپنے مفاد کو دوسروں کے مفاد

پر مقدم کرنے کے عادی ہیں وہ اپنے مفاد کے لیے نہایت بے رحمی کے ساتھ اپنے بھائیوں کا گلا کاٹ دیتے ہیں وہ ذرا مذکورہ بالا حدیث پر نظر کریں کہ وہ ان کے متعلق کیا حکم دے رہی ہے۔ ایک موقعہ پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس مذموم کیفیت سے مسلمانوں کو بچانے کے لیے یہ فرمایا ہے۔

"جس شخص نے ایسی حالت میں صبح کی کہ وہ مسلمانوں کی فکر سے خالی ہے تو وہ مسلمانوں میں سے نہیں ہے۔"

قرآن کریم نے حضرات صحابہ کی بہت بڑی شان ان کی عبادت کو قرار نہیں دیا جس کا نفع وضرر شخصی ہوتا ہے بلکہ ان کی امتیازی شان یہ تبلائی ہے۔

یوثرون علی انفسہم (یعنی) وہ اپنے نفسوں پر دوسروں کو مقدم فرماتے تھے۔

اس سلسلہ میں جنگ یرموک میں چند غازیانِ اسلام کا واقعہ ہماری بصیرت وعبرت کے لیے بہت کافی ہوسکتا ہے کہ میدانِ قتال میں چند صحابی دم توڑ رہے ہیں اور شدتِ نزع میں پانی مانگ رہے ہیں مگر جس کے پاس پانی پیش کیا گیا اسی نے دوسرے سسکتے ہوئے صحابی کی طرف اشارہ کیا کہ پہلے ان کو پلاؤ آخر سب نے اسی طرح سے جان دے دی اور کسی کو بھی پانی پینا نصیب نہ ہوسکا۔

یہ تھا حقیقی اسلام جو اب خواب وخیال ہو کر رہ گیا ہے۔

اصولاً انسانی تعلقات تین طرح کے ہوتے ہیں۔ یا کوئی کسی سے بڑا ہوتا ہے یا چھوٹا یا برابر۔ بڑے کے لیے تعظیم وتوقیر واجب ہے خواہ وہ استاد ہو یا ماں باپ اور سرپرست، حاکم ہو یا ہادی، اہلِ کمال ہو یا اہل تقویٰ سب

کے لیے یہی حکم توقیر ہے چھوٹوں پر رحم اور شفقت کرنا واجب ہے جیسا کہ حدیث میں آیا ہے۔

من لم یرحم صغیرنا ولم یوقر کبیرنا فلیس منا۔۔

جس نے ہمارے چھوٹوں پر رحم نہ کیا اور بڑوں کی تعظیم وتوقیر نہ کی وہ ہم میں سے نہیں ہے۔

باقی رحم وشفقت کا یہ مطلب بھی نہیں ہے کہ ہم اپنے چھوٹوں کی بداخلاقیوں سے درگزر کرتے ہوئے ان کو ان کے حال پر چھوڑ دیں کہ یہ ان کے ساتھ شفقت نہ کہلائے گی بلکہ غلط استعمال کی وجہ سے ظلم کہلائے گا۔ برابر والوں کے لیے پہلے حدیث وقرآن سے یہ عرض کر دیا گیا ہے کہ ان کے لیے ایثار و محبت کا برتاؤ ہونا چاہیے۔ حدیث میں ہے مسلمانوں کے درمیان کرا دینا تمام نمازوں اور روزوں سے بہتر ہے اپنے بھائیوں کی خبر گیری کے متعلق ارشاد نبوت ہے جس نے اپنے کسی مسلمان بھائی کی حاجت کو پورا کرنے میں رات دن (بخلوص نیت بلا کسی ذاتی غرض کے) کوشش کی خواہ وہ کام پورا ہو یا نہ ہو ہر حالت میں یہ کوشش دو مہینہ کے اعتکاف سے افضل ہے۔ باقی حسد اور بغض وغیرہ کی ممانعت کے متعلق بہت سخت قسم کی تاکیدیں احادیث صحیحہ میں مذکور ہیں جن کی تشریح کی ضرورت نہیں کیونکہ ان کو ہر ایک کوئی برا سمجھتا ہے معلوم ہوا کہ بخل وخود غرضی بے رحمی وبے ادبی اور بغض وعناد وغیرہ یہ سب امور اسلام کے منافی ہیں اور ایسے امور سے اسلام کی اجتماعی ہیئت کو کاری ضرب لگتی ہے حضور علیہ الصلوۃ والسلام نے فرمایا ہے۔

"اسلام جماعت کا بہت زیادہ محتاج ہے جس قدر جماعت اسلام کی محتاج ہے۔ بد خلقی سے فقر و افلاس وغیرہ کی بلائیں بھی انسان پر مسلط ہوتی ہیں"

غور کیجئے تو نظر آئے گا کہ نظام معاشرت و تمدن کی نو ہی اصولی بنیادیں ہیں نفس۔ عقل۔ اخلاق۔ ایمان۔ عمل۔ قانونِ عدل۔ امن عامہ۔ عہد۔ نظم ملک۔ پس ان میں سے کسی کے ساتھ بھی نفس کی شرارتوں کو متعلق کر کے ان میں بدی پیدا کرنا فساد ہے لہذا نو ہی اصول فساد ہونگے۔ بدنفسی۔ بدعقلی۔ بد خلقی۔ بے ایمانی۔ بدکرداری بے انصافی۔ بدامنی۔ بدعہدی۔ بدنظمی۔ ان نو مفسدوں میں جب کوئی قوم گرفتار ہو جاتی ہے تو پھر اس کا پنپنا محال ہو جاتا ہے۔ آدمی کی خواہشیں اور سعی ہمیشہ حسب ذیل نو امور پہ دائر و سائر رہتی ہیں جو یہ ہیں۔ جان۔ مال۔ عزت۔ رزق۔ زمین وسائلِ معاش سعی۔ بدل و معاوضہ۔ ان مذکورہ بالا نو امور میں اگر انسان کی خواہشیں اعتدال سے گزر جاتی ہیں اور اس کے احساسات برائیوں کو قبول کرنے لگتے ہیں تو حسب ذیل نو خرابیاں پیدا ہو جایا کرتی ہیں جو یہ ہیں۔ کراہتِ موت۔ زر پرستی۔ بے غیرتی۔ بے روزگاری۔ بے تمکینی۔ بے وسیلگی۔ بدمعاشی۔ بے عملی۔ بدمعاملگی۔ پھر ایسی قوم میں حسبِ ذیل نو امراض قبیحہ بھی ہو جاتے ہیں۔ زنا۔ چوری۔ قزاقی۔ فحاشی و منکرات۔ قتل اغواء۔ شراب۔ جوا۔ خیانت۔

ان امراض کے نتیجہ میں حسبِ ذیل نو عذابی سلسلوں میں ایسی قوم گرفتار رہا کرتی ہے۔ ٹڈی دل۔ وبا۔ مرگ ناگہانی۔ قحط۔ خونِ ناحق۔ طوفان۔ نقصان ثمرات حشرات الارض کی ایذاء۔ ضیق صدر۔

اس وقت قوم مسلم بدکلامی و بدمعاملگی میں دوسری قوموں سے نمبراول ہے
کی لیے تجارت میں فیل ہے کسی مسلمان تاجر سے سودا لیجئے وہ ذراسی بات پہ
ناک بھوں چڑھاتا نظر آئے گا۔ پھر لہو و لعب میں بھی یہ قوم طاق ہے جس طرح
سے بدکلامی میں نمبراول ہے اسی طرح خوش کلامی میں صحیح استعمال سے بھی محروم
ہے۔

آج مشاعروں کی وبا نے اس قوم کا بیڑا غرق کر دیا ہے دوسری قوموں کو
کاروبار سے فرصت نہیں اور مسلمان بچے عشق بازی کے ٹھیکہ دار بنے ہوئے
ہیں۔ گویا عقل دوسری قوموں کے لیے ہے اور عشق ان کے لیے ہے پھر جو عشق مجازی
سے گزر کر عشق حقیقی کی طرف بڑھتے ہیں وہ بھی بوجہ غلو کے رہبانیت کی طرف مائل
ہو کر کچھ مفید نہیں رہتے اسلام تو کمالِ عقل و عشق کے مجموعہ کا نام ہے جو صبر و ادب
کی قبا میں پہن کر بروئے کار آتا ہے۔ یاد رکھو کہ آدمی معاملہ سے پہچانا جاتا ہے
مسلمانوں کی یہ تمام خرابیاں تدبیر منزل کی خرابی سے وابستہ ہیں۔ ہر خاندان میں ایک
بڑا ہونا چاہیئے جو ایک طرف تو اپنے خاندان کی روحانی و اخلاقی اصلاح کرے اور
دوسری طرف اس کی مادی اصلاح کی طرف بھی متوجہ رہے یعنی ان کی معاش کو
مہذب بنائے جب خاندان وار اصلاح کا نظام ہماری قوم میں پیدا ہو جاوے
گا تو پھر ملک وار اصلاحی پروگرام بھی بآسانی بن سکیں گے۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ درستی اخلاق بذریعہ صحبت صالحین ہر ایک پہ واجب
ہے اور تکمیل اخلاق نقل ہے جس کا واحد ذریعہ اتباعِ دین ہے۔ جو اصلاح اتباع
دین کے ذریعہ سے نہ ہو وہ معتبر نہیں ہے۔



اخلاق کو مہذب بنانے والی چیزیں دس ہیں۔

دس تہذیبیں

تہذیب اول یہ ہے کہ ہم کانوں سے کسی بری بات کو نہ سنیں نہ برے تذکروں کے سننے کا اپنے کو عادی بنائیں۔

دوسری تہذیب یہ ہے کہ ہم آنکھوں سے کسی چیز کو بری نیت سے نہ دیکھیں نہ ممنوعہ مقامات ہی کو دیکھ کر نظر کو آلودۂ معصیت کریں جن کے دیکھنے کو خدا نے ممنوع ٹھہرایا ہے جیسے اجنبی عورت کا ستر وغیرہ دیکھنا۔ نہ کسی کو گھوریں کہ یہ بھی نگاہ غضب کی علامت ہے

تیسری تہذیب یہ ہے کہ ہم زبان سے کوئی بری بات بھی نہ نکالیں نہ کوئی ناجائز چیز کا ذائقہ ہی چکھیں۔

چوتھی تہذیب یہ ہے کہ ہم ہاتھوں سے کوئی ایسی چیز بھی نہ چھوئیں جس کے چھونے کو خدا نے منع ہے۔

پانچویں تہذیب یہ ہے کہ ہم حرام ناپاک چیزوں کی بو وغیرہ بھی اپنی ناک کے ذریعہ سے دل و دماغ تک نہ پہنچائیں

یہ پانچ تہذیبات حسیہ ہیں جو حواس خمسہ کو پاک بناتی ہیں اور ان کو اعتدال پہ لائے بغیر تم کبھی اپنی زندگی کو کامیاب نہیں بنا سکتے۔

ایک تقسیم اس سلسلہ کی اور بھی ہے۔

پہلی قسم تہذیب اقدامات ہے یعنی فکر و عمل وغیرہ سے متعلق معاملات و مسائل ہیں جس کے تم مجاز اور اہل نہ ہو دخل در معقول سے کرپہل کرنا۔ ان کو اپنے ہاتھ میں لے لینا یہ بھی بد تہذیبی ہے جیسے آج بہت سے غیر علماء و زعماء قوم کی رہنمائی قوم کے اقدامات بے جا کرتے ہیں حالانکہ وہ واقعۃً اس کے اہل نہیں ہوتے ایسے سب امور سوسائٹی کو خراب کرنے والے ہیں۔

دوسری قسم تہذیب اصوات ہے یعنی بوقت انعقاد مجلس و اجتماع اکابر مجلس کے احترام و ادب کو بالائے طاق رکھ کر سخت اور غیر موزوں بلندئ صوت سے کلام کرنا بھی بے تہذیبی ہے جس کا رفع کرنا ہمارے لیے ضروری ہے۔

تیسری قسم تہذیب اخبارات ہے یعنی جو خبریں ہم کو موصول ہوں یا جن پر ہم مطلع ہوں انہیں بغیر تحقیق کامل محض خوش اعتمادی پر دوسروں سے نقل کر دینا اور نفس پرستوں کی بیان کردہ روایتوں پر کان دھرنا بھی بد تہذیبی ہے جس کے مفاسد آجکل بکثرت رونما ہیں حالانکہ کسی روایت یا قول کا بغیر تحقیق نقل کر دینا ہی نقل کرنے والے کے جھوٹا ہونے کے لیے کافی ہوتا ہے۔

چوتھی قسم تہذیب مزاحات ہے اس میں غیر شریفانہ بازاری طرز کا مذاق گالی گلوچ ایک دوسرے پر بہتان کسنا برے نام اور برے القاب دینا یہ بھی اجتماعی زندگی کے لیے تباہ کن اور سخت قسم کی بد تہذیبی ہے جن سے مسلمانوں کو بہت زیادہ بچنے کی ضرورت ہے۔

تہذیب خیالات ہے۔ خیال کی نیکی اور بدی پر

پانچویں قسم کے تمام اقوال وافعال وغیرہ کا دارومدار

لوگوں کے متعلق برے خیالات رکھنا برے خیالات کو جلد قبول کرنا

گمان نہ رکھنا ان کو عملی جامہ پہناتے ہوئے غیبت وچغل خوری وغیرہ کرنا

امور بھی بدتہذیبی پر مبنی ہیں جن سے اسلام بچنے کا حکم دیا ہے باقی اس کا

مطلب نہیں کہ ہر خودغرض چالاک تمہیں اپنی غرض کا لقمہ تر بنا کر نگل جا

ایسے موقعوں پر چوکنا رہنا ہی تہذیب ہے۔

بدنفس مباش بدگماں مباش وز فتنہ وجگہ دراماں باش

پس جو قوم حق تعالیٰ سے علم واقتدار حاصل کرتی ہے سب سے پہلے اس

کان اور آنکھ اور دل عطا کیا جاتا ہے یعنی وہ بڑے دلیر ہوش گوش والے ہو

ہیں حواس خمسہ کا ٹھیک کر لینا گویا اپنی باطنی دنیا کو درست کر لینے کے ہم

ہوتا ہے۔

عقل ونقل

بائیسواں عقیدہ یہ ہے کہ عقل بشر مدار نجات نہیں ہے بلکہ مدار نجات وحی

الٰہی ہے جو پیغمبر سے نقل ہو کر ہم کو حاصل ہوئی ہے۔ عقل ایک نعمت ہے اس

بلاشبہ بڑی نعمت ہے اسی سے کسی چیز کے حق اور ناحق ہونے کا ثبوت دلائل

و براہین سے حاصل کیا جا سکتا ہے۔ مگر چونکہ انسانوں کی عقلوں میں بڑا فرق

ہے بالخصوص جب انانیت بھی اس کی رہنما ہو جائے تو پھر اس کے بعد تو ایک

اتنی بھی ایک بڑے عالم کے خلاف آواز ے کس دیتا ہے ویسے بھی غیبی اُمور کا انکشاف عقل بشر سے نہیں ہو سکتا اس لیے ماننا پڑے گا کہ اختلافات انسانی کو اگر کوئی چیز سطح مرتفع پر لاسکتی ہے تو وہ وحیِ الٰہی ہی ہے اب رہ جاتی ہے یہ بحث کہ ہم کس کی عقل سے وحیِ الٰہی کو سمجھیں سو عقلِ سلیم یہ کہتی ہے کہ ہم کو جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عقل مبارک سے وحی و اسلام کو سمجھنا چاہیئے کہ حضور نے اسلام کی تعلیم کیا دی ہے اور اس کے متعلق کیا فرمایا ہے؟ سو یہ محض نقل سے متعلق ہے اس میں ہماری عقل کا دخل کچھ نہیں ہے۔ ہاں اسلام کو نقل سے سمجھ لینے کے بعد اگر خداوند عالم نے عقل و فہم عنایت کیا ہے تو تم قرآن میں غور کر سکتے ہو اور دلائل و براہینِ عقلیہ کے زور سے بھی اسلام کی تقویت کا موجب ہو سکتے ہو مگر پہلے تمہیں نقل ہی پر بھروسہ کرنا ہوگا جو حضورؐ کے صحابہؓ سے اور حضورؐ کی تعلیمات سلفاً عن خلف ہم تک پہنچی ہیں یہ بالکل غلط طریقہ ہے کہ اگر کوئی تھیوری کسی یورپ کے فاضل کی تمہیں پسند آگئی تو تم اسی پر اسلام کو ڈھالنا شروع کر دو۔ قرآن پاک نے پہلے اپنی تعلیم کی طرف توجہ دلائی ہے پھر تدبیر اور تفکر کا حکم دیا ہے۔ پس آج کل کے نوجوانوں کو بھی دین کے بارے میں اپنی عقل کے موافق اسلام کو سمجھنے کی کبھی کوشش نہیں کرنی چاہیئے کہ یہ طریقہ گمراہی کا طریقہ ہے۔ اگر فن طب بغیر کسی طبیبِ حاذق سے سیکھے ہوئے اور اس کی صحبت اختیار کیے ہوئے نہیں آسکتا۔ آخر قرآن و حدیث جو فی الحقیقت طبّ رُوحانی ہیں بغیر معلمان ربانی کے کیسے ہم کو حاصل ہو سکتی ہیں؟ مثل مشہور ہے "ہر کارے و ہر مردے" ہر کام کی اللہ تعالیٰ نے ہر ایک میں استعداد نہیں رکھی ہے بلکہ جو جس کا کام ہوتا ہے وہی اس

سزاوار ہوتا ہے۔

ایمان و کفر:

تیئسواں عقیدہ اہلِ حق یہ ہے کہ ایمان جملہ عبادات و معاملات کی جڑ اور ان کی روح ہے ایمان کے بغیر نہ دنیا ہی کا کوئی کام سنور سکتا ہے نہ آخرت ہی اس کے بدون درست ہو سکتی ہے جس قدر بھی اس کی زیادتی دلوں میں ہوتی ہے اسی قدر دنیا میں خیر و برکت پائی جاتی ہے اور جس قدر اس کی کمی ہوتی ہے اسی قدر فساد و ظلم کی کثرت دنیا میں ہوتی ہے۔ جو ساری دنیا میں اس وقت ہلچل مچی ہوئی ہے اس کا سبب صرف یہی ہے کہ لوگوں میں ایمانداری کا مضمون روز بروز کم ہوتا جاتا ہے ایمان کے ستر شعبے ہیں ان میں سے پہلا شعبہ اقرار توحید و رسالت ہے اور ادنیٰ شعبہ ایمان کا یہ ہے کہ راستہ سے کسی ایذا پہنچانے والی چیز کو ہٹا دیا جائے تاکہ دوسرے لوگ تکلیف سے بچ جائیں۔ آہ! کہ آج یہ ادنیٰ مرتبہ بھی ایمان کا عام طور سے دیکھنے میں نہیں آتا۔ اصطلاح شرع میں ایمان اس کو کہتے ہیں کہ جناب محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کو خدا کی طرف سے جو احکام اور تعلیم دی گئی ہے ان کا پیروکار ان سب تعلیماتِ غیبیہ کو دل سے سچ جانے اور یقین کرے ان کی صداقت میں اسے کوئی ادنیٰ بھی شبہ نہ ہو اور زبان سے ان سب امور کا اقرار کرتے ہوئے یہ گواہی دے کہ اللہ کے سوا تمام جہان میں کوئی بھی معبود و مسجود خلائق نہیں ہے اور یہ کہ جناب محمد الرسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سچے بندے اور اس کے رسول آخر ہیں۔

یہ ایمان اجمالی ہے جب بھی کوئی شخص ان امور کو دل سے بالاجمال مان کر زبان سے اقرار کر لیتا ہے مسلم و مومن کہلانے لگتا ہے اور تادم مرگ اگر اس پر قائم رہتا ہے تو اس کی موت اسلام پر ہوتی ہے اور ایمانِ تفصیلی یہ ہے کہ جو احکام و مسائل قرآن کریم کی عبارت اور حدیث متواترہ سے ثابت ہوں جو قطعی الثبوت ہیں ان کے حق ہونے کا اقرار کرے اور جملہ اُصولِ اسلام کو ایک ایک کر کے حق سمجھے مثلاً اللہ کی وحدانیت پر اور اس کے وجود ازلی و ابدی پر ایمان لانا اس کو تمام کمالات کا سرچشمہ و سرمنشا سمجھنا جملہ عیوب و نقائص اور حدبندیوں سے اس کو پاک اور بالا تصور کرنا۔ فرشتوں کے وجود کو حق جاننا جملہ انبیاء علیہم السلام پر ایمان لانا حضور کو سب انبیاء کا آخر تسلیم کرنا تمام آسمانی کتابوں کو جو آنحضرت سے پہلے نازل ہوئیں حق سمجھنا قرآن کریم کو ان سب کا خلاصہ سمجھ کر اب اسی کو مدار نجات تصور کرنا۔ مرنے کے بعد دوبارہ زندہ ہونے قیامت اور جزا و سزا کا اقرار کرنا۔ اللہ اور اس کے رسول اور جو امیر بطور نائب رسول قوم کی طرف سے منتخب ہو۔ ان تینوں کی اطاعت کو واجب سمجھنا۔ نیز بروئے آیہ کریمہ انا کل شیئ خلقناہ بقدر (ہر چیز کو ہم نے ایک اندازہ کے ساتھ پیدا کیا ہے) تقدیر کو تسلیم کرنا، یہ ایمان تفصیلی ہے جو شخص ان میں سے کسی جزو کا انکار کرے یا سب کو نہ مانے وہ اصطلاح شرع میں کافر کہا جاتا ہے اور اگر اسی حالت کفر میں کوئی مرتا ہے تو اس کی سزا ابدی ہوتی ہے اور جہنم اس کا ٹھکانہ بنتا ہے۔

کفر کے معنی انکار کے ہیں کفر ایمان کی ضد ہے بعضوں نے تقدیر کے

منکر کے کفر میں تامل کیا ہے لیکن چونکہ وہ آیتِ تقدیر کا منکر ہے اس لیے جو
انکار جزو قرآن اس کے کفر میں بھی شبہ نہیں کیا جاسکتا خوف کے موقعوں پر
جہاں اظہار ایمان و اسلام سے جان کا خطرہ ہو ایسے مواقع میں اہل ایمان کے
لیے بجمیع حالات ایمان صرف تصدیق قلبی بھی معتبر سمجھی جائے گی لیکن عام طور پر
ایمان کے لیے صرف تصدیق قلبی کافی نہیں ہے۔ بلکہ زبانی اقرار بھی ہونا چاہیے
کیونکہ دل سے تو بعض کفار بھی اسلام کو اور حضور کو حق سمجھتے تھے۔

ایمان میں کمی بیشی :-

ایمان قلبی اپنے ابتدائی مرتبے کے لحاظ سے نہ کم ہوتا ہے نہ زیادہ وہ
ایک نقطۂ انور ہے جو اقرار توحید و رسالت سے سویدائے قلب میں قائم ہو
جاتا ہے اور بصورتِ عدم تبدیلی عقیدہ تا دم مرگ قائم رہتا ہے۔ عمل ایمان مجمل
کا جزو نہیں ہے۔ اسی لیے گناہ کرنے کی حالت میں بھی یہ مرتبہ ایمان کا قائم
رہتا ہے البتہ اعمالِ صالحہ ایمان کامل کا جزو ہوتے ہیں۔ کمی زیادتی ایمان کامل
میں ہوتی ہے۔ ایمان مجمل میں نہیں ہوتی۔ ایمانِ مجمل کفر و شرک اور اصول دین
کے انکار سے زائل ہوتا ہے۔ ایمان کے معنی یقین کے ہیں۔ اس کے تین درجے
ہیں۔ درخت کے وجود کا یقین علم الیقین ہے اسے آنکھ سے دیکھ لینے کا نام
عین الیقین ہے اور اس کے نفع نقصان کے مشاہدہ کر لینے کا نام حق الیقین ہے
فرض کو فرض سمجھتے ہوئے ترک کرنا معصیت ہے اور اس کو فرض ہی نہ سمجھنا
چنانچہ بالقصد اسے ترک کرنا کفر ہے یہی مطلب من ترک الصلوۃ متعمداً

فقد کفر کا ہے یعنی جس نے قصداً وعمداً نماز کو فرض نہ سمجھتے ہوئے ترک
کر دیا تو اس نے واقعتاً کفر کیا۔ کفر و ایمان کے درمیان ایک اور ہے جس کا نام
نفاق ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ دل میں کفر ہو زبان پر بوجہ عیاری و مکاری اسلام
ہو نفاق صدیقیت کی ضد ہے۔ صدیقیت ظاہر و باطن میں یکسانیت والہیت
کا نام ہے اور نفاق میں اس کے برعکس فساد باطنی ہوتا ہے۔

شرک کے یہ معنی ہیں کہ کسی مخلوق کو خالق کے برابر درجہ عبودیت دے
دیا جائے خواہ ذات کے لحاظ سے ہو۔ یا صفات کے
لحاظ سے ہو کفر و شرک ناقابل معافی جرائم ہیں کفر و شرک خدا سے ایک کھلی بغاوت
ہے جس کی سزا ابدی جہنم ہے شرک چونکہ مخلوق کو خالق کا شریک ٹھہراتا ہے یعنی غیر
محدود کو محدود کرتا ہے اس لیے شرک کی ذہنیت قدرتاً تنگ ہوتی ہے اور
کفر میں چونکہ انکار و علم بغاوت بلند کیا جاتا ہے اس لیے اس کی ذہنیت متکبرانہ
ہوتی ہے۔ اس کے برعکس ایمان کی طبیعت میں وسعت و خاکساری ہوتی ہے۔

تعریفِ تقدیر :-

چوبیسواں عقیدۂ اہلِ حق یہ ہے کہ کائنات کی ہر ایک چیز کو حق تعالیٰ نے ایک
خاص اندازہ و مقدار کے ساتھ پیدا فرمایا ہے اور عالم کی جملہ قوتوں کے لیے اس
کی جانب سے ایک پیمانہ و مدت مقرر ہے چنانچہ ہر چیز کا اسی اندازۂ مقررہ کے
مطابق اپنے اپنے وقت پر ظہور پذیر ہونا پھر اسی اسلوب تقدیر پہ ان کا مرتبہ فنائیت
اختیار کر لینا یہی مقدرات ازلی ہیں جو نہ ٹل سکتے ہیں اور نہ جن کا خلاف ہی کبھی ممکن

ہے اسی کا نام تقدیرِ الٰہی ہے جس کا علم کسی کو نہیں دیا گیا ہے۔

تقدیر حق تعالیٰ کا ایک خاکہ علم و قدرت وغیرہ ہے جو اس نے چشم زدن میں ہر ایک ذوی العقول وغیر ذوی العقول کے لیے ازل میں مرتب فرمایا تھا پس یہ یقین کر لینا کہ ہر چیز اسی اسلوبِ تقدیر پر بروئے کار آتی ہے اور ہر ایک قوت خدا کے قائم فرمودہ اسلوب قدرت کے مطابق ایک خاص شکل و صورت کے ساتھ اپنی مقررہ مدت میں ایک آیتِ حق بن کر اس عالم میں نمودار ہوتی ہے اسی کو اعتقادِ تقدیر کہتے ہیں۔

قدر کے معنی تخمینہ و اندازہ کے ہیں وما ننزلہ الا بقدر معلوم ٥ ہم نے کوئی چیز نازل نہیں کی مگر ایک اندازہ معلومہ کے ساتھ۔

تعریف تدبیر :۔

نیز جو ظاہری باطنی قوتیں اس عالم میں انسان کو تادم مرگ خلیفۂ کائنات ہونے کی حیثیت سے خدا کی جانب سے بخشی گئی ہیں انسان کا اپنی حیات متعار سے اپنے اختیار مستعار سے کام لیتے ہوئے عطا شدہ شعور کلی سے ان میں توڑ جوڑ پیدا کرنا اور خدا کے عطا فرمودہ اختیار و قدرت سے اسباب کو حرکت میں لا کر کسی سبب کو اختیار کرنا اور کسی کو چھوڑ دینا اور بلحاظ نتائج ان سے نفع نقصان اٹھانا تدبیر ہے۔ گویا فکر و عمل کے مراتب و درجات کا نام تدبیر ہے جن میں انسان کو بلحاظ خیر و شر بقول آیہ کریمہ کلا نمد ھؤلاء وھؤلاء من عطاء ربک اور بروئے آیہ کریمہ وان عدتم عدنا خیر و شر کے انتخاب کا حق حاصل ہوتا ہے۔

کر چاہے وہ شر کی راہ کو پسند کرے اور چاہے تو خیر کی راہ کو اپنا لے اسی لیے جب بھی انسان بداعمالی کی طرف لوٹتا ہے تو اللہ کا قانون مجازات و قانون تقدیر بھی پاداش و عقوبت کی طرف لوٹ جاتا ہے جونہی وہ بدنی کا رخ کرتا ہے مانتائج عمل کا قانون بھی پاداش و عقوبت میں سرگرم کار نظر آنے لگتا ہے اور فکر و عمل کے بالمقابل نتائج عمل کا نام تقدیر ہے جو انسان کے بس کی نہیں نہ کسی تدبیر عمل کے نتائج سے بالکلیہ کسی کو خبردار ہی کیا گیا ہے اسی تقصیر علم نتائج کی وجہ سے بعض مرتبہ انسان ایک تدبیر کو اپنے لیے مضر جانتا ہے مگر وہ اس کے حق میں مفید ہوتی ہے اور بعض اوقات کسی چیز کو محبوب رکھتا ہے حالانکہ بلحاظ نتیجہ وہ اس کے لیے مضرت رساں ہوتی ہے۔ پس تقدیر پر ایمان لانا اس کو نہ ٹٹولنا نتیجہ کو عمل پر مرتب جاننا اور اعمالِ خیر و شر میں سے بروئے عطا شدہ اختیار انسان کا اپنے لیے اعمالِ خیر کو اختیار کر کے نتائج خیر کی خدا سے لو لگانا اور شقاوت و سعادت کے جملہ نتائج تقدیر کا مالک حضرت خالق ہی کو جاننا اور ان کے ترتب میں اسے مجبور نہ سمجھنا ہی اہل سنت والجماعت کا مسلک ہے۔ اہل حق کے نزدیک خدا کی حیثیت ایک مجسٹریٹ کی سی نہیں ہے جو قانون کے تحت کسی کو سزا دینے پر مجبور ہوتا ہے اور کسی کو چھوڑنے پر راضی ہوتا ہے بلکہ وہ جو کرتا ہے وہی حق ہوتا ہے۔

انسان نہ مجبور ہے نہ مختار ہے

چونکہ انسان کو کائنات کی سرداری بخشی گئی ہے اور ضعیف الاعضاء

برہنہ جسم پیدا ہونے والے نازک بدن حیوان کو دیگر حیوانات سے یکسر مختلف پیدا کیا گیا ہے چنانچہ جب وہ دنیا میں آتا ہے تو اس کی فطرت بالکل سادہ ہوتی ہے تاریکی وجہل وظلمت سے وہ گھرا ہوا رہتا ہے پھر اپنے شباب پر آ کر بوجہ نورِ علم وعقل یہی ظلوم جہول اپنی کاوش وحکمت سے تمام کائنات کو مسخر کرنے کی صلاحیتیں پیدا کر لیتا ہے اسی لیے از روئے عقل وانصاف اصولاً نہ انسان کو جمادِ لایعقل کی طرح سے محرک بے شعور اور قدرت واختیار سے مجبورِ محض ہی قرار دیا جائے تو وہ قادرِ مطلق کا نائب نہیں قرار پا سکتا اور اگر معاذ اللہ اسے مختارِ مطلق مانا جائے تو پھر نائب میں اور منیب میں کوئی فرق باقی نہیں رہ سکتا اس لیے یہ تسلیم کرنا ناگزیر ہے کہ انسان مجبور بھی ہے اور مختار بھی ہے اپنے دائرہ میں عمل کے لحاظ سے مختار ہے اور ان کے نتائج کے لحاظ سے مجبور ہے یہی وجہ ہے کہ اس کی تقدیر بھی جبر واختیار سے مرکب بنائی گئی ہے۔ چنانچہ بعضے تقدیرات تو وہ ہیں جو خود اس کے دائرہ اعمال سے تحت مشیتِ الٰہی ظہور میں آتی ہیں ... مثلاً زید کا کسی سے شادی کر لینا یا اس کو طلاق دینا۔ کسی کی ملازمت کر لینا اور اسے چھوڑ دینا۔ ایجادات ومصنوعات میں اپنی عقل کے زور سے قسم قسم کی نئی سے نئی چیزیں بنانا اور ارواحِ عالم کو اپنے قبضہ میں لے کر تسخیرِ کائنات کے عظیم الشان مرتبہ پر پہنچ جانا وغیرہ وغیرہ اور بعض تقدیریں وہ ہیں جن میں انسان کے فکر وعمل کا کوئی دخل نہیں ہوتا بلکہ تکوینی طور پر خود کارکنان قضا وقدر کی جانب سے وہ نتائج اور احوال غیر اختیاری طور سے انسان کے لیے واقع کیے جاتے ہیں جیسے کسی کا مر جانا اور اس کی حیات میں کمی یا زیادتی کا نہ ہونا وغیرہ وغیرہ۔

اصل اختیار حق تعالیٰ کا ہی ہے

معلوم ہوا کہ اصل اختیار تو قادرِ مطلق ہی کا ہے جو ازل سے مختارِ کل ہے اور ابد تک اسی صورت سے رہے گا۔ باقی انسان کی روح کو اس ہیکل جسمانی میں آ جانے کے بعد سے تا بقائے جسم خدا کی مقررہ فرمودہ حدود میں کس قدر تصرف کرنے کا حق ملتا ہے سو گو یہ اختیار بھی غور سے دیکھیے تو اس جسم مردہ میں زندگی پانے والا انسان کا ذاتی نہیں ہے بلکہ عطائے پروردگار ہی ہے اور حقیقتاً قادرِ مطلق کے جلال ابدی واختیارات دائمی کے پیش نظر تو یہ حیوان آخر کلیتہً بے بس اور مجبور ہی دکھائی دیتا ہے مگر اپنے ماتحتوں کے لحاظ سے کسی قدر اس میں اختیار وقدرت کی شان بھی جھلکتی ہے اور سچ پوچھیے تو وہ نورِ قدرت بھی اسی آفتاب قدرت کا ایک پرتو ہوتا ہے جو اس میں جھلکتا ہے تاہم بندہ کے کسب وعمل کی نسبت سے کسی نہ کسی درجہ میں انسان کو مختار تسلیم کیا جانا بھی بلحاظِ جزا وسزا ناگزیر ہے۔

تقدیراتِ عمل وتقدیراتِ نتائج

پس جو تقدیراتِ الٰہیہ ہمارے مقررہ دائرہ اختیار وقدرت سے ہماری معرفت ظہور میں آئیں وہ تقدیراتِ اختیاریہ ہیں جن کا نام ہماری نسبت کی وجہ سے کسب وتدبیر رکھ دیا گیا ہے جن میں ہماری عقل ہماری قدرت اور ہمارا ارادہ خدا کے آگے جواب دہ ہوتا ہے اور جو تقدیراتِ الٰہیہ ہمارے اختیار وتصرف

سے ظہور میں نہ آئیں بلکہ غیر اختیاری طور سے خود کارکنانِ قضا و قدر کی جانب سے ہمارے لیے واقع ہوں جن کے لینے پر ہم مجبور ہیں۔ جیسے مثلاً موت جس کے لیے یہ کہنا موزوں ہے :۔

"شاید باید زیستن ناشاد باید زیستن"

انہیں تقدیرات قضاء و قدر کہنا مناسب ہے۔

اس کو وضاحتِ مزید کے لیے درج ذیل مثال میں یوں سمجھیے۔

زید کا اپنی محنت و کوشش سے علم حاصل کرنا اور آخر اپنی محنت و کاوش سے علم و حکمت کا سمندر ہو جانا یہ انسان کا ایک اختیاری فعل ہے گو استعداد فکریہ اس کے لیے بھی غیر اختیاری ہی ہے کیونکہ وہ کسی کسب و عمل کا نتیجہ نہیں ہوتی تاہم محنت و کاوش کی وجہ سے جہل سے اس کو علم ضرور حاصل ہو جاتا ہے لیکن ایک دم مکان کی چھت کا زید پر گر جانا جس کی وجہ سے فی الفور اس کا موت واقع ہو جانا یہ ایک غیر اختیاری امر ہے جس میں زید کے علم کا کوئی دخل نہیں ہے پس زید کو بیک وقت عالم بھی کہیں گے اور بلحاظ اپنی اچانک موت کے جاہل بھی کہیں گے اگر اسے ذرا بھی یہ علم ہوتا کہ اتنے بج کر اتنے منٹ پر میرے مکان کی چھت گرنے والی ہے تو وہ یقیناً اپنے کو بچانے کی کوشش کرتا۔

الغرض تحصیل علم و حکمت تدبیر ہے اور ایک دم زید کی موت سے ان کا بے نتیجہ و بے ثمر ہو جانا تقدیر ہے وہ اختیاری ہے یہ غیر اختیاری ہے پھر اصولی و کلی تقدیرات عالم کے ضمن میں ہر سلسلہ کی تقدیریں اور اس کے خاکے بھی جدا جدا مرتب ہیں مثلاً :۔

نا و بقا کے سلسلہ میں ایک تقدیر الٰہی یہ ہے کہ جو چیز بھی پیدا کی جائے گی ی مدت پوری کر کے یقیناً فنا سے دوچار ہوگی یہ تقدیر غیر اختیاری ہے و دنیا کی کوئی طاقت نہیں ٹال سکتی خواہ اس میں کوئی نبی ہو یا ولی، فرشتہ ہو یا انسان ہو یا حیوان، شجر ہو یا حجر، موت سب کے لیے لازم ہے۔

تدابیر صحیح سے کامیابی ہوتی ہے

اسی طرح سے مثلاً کسب و عمل کے سلسلہ کی ایک تقدیر یہ ہے کہ عادۃً و عامۃً بیر صحیح سے کامیابی ہوگی اور ترک تدبیر سے ناکامی ہوگی پس اگر کسی مدبر کو تدبیر صحیح ا وجہ سے کامیابی ہو اور اس کا نتیجہ اس کے حق میں محمود نکلے اور ترک تدبیر یا سوءِ بیر سے کسی غیر دانشمند کو ناکامی ہو تو یہ نہیں کہا جائے گا کہ تقدیر الٰہی کا خلاف ہوا یہی کہا جائے گا کہ عین منشاءِ قدرت کے مطابق ہوا ہے۔ رہا یہ کہ ہم تدبیر صحیح کس و سمجھیں اور غیر صحیح کس کو قرار دیں سو یہ ایک جداگانہ مسئلہ ہے جس کا اس موضوع سے کوئی تعلق نہیں ہے یہاں تو اس سلسلہ میں بس اتنا ہی اشارہ کافی ہے کہ جس دبیر کا صحیح نتیجہ برآمد ہو جائے وہ تدبیر صحیح کہلائے گی اور جس کا نتیجہ غلط برآمد ہو جائے وہ تدبیر صحیح قرار نہیں پائے گی۔

عناصر اربعہ کی تقدیرات

عناصر اربعہ کے سلسلہ کو لے لیجئے تو وہاں بھی یہی اسلوب تقدیر نظر آتا ہے پانی کے لیے تقدیر عمومی یہ ہے کہ وہ ہر چیز کو بہائے اور اس میں سیلانی کیفیت

پیدا کرے۔ آگ کے لیے تقدیرِ عمومی یہ ہے کہ جو بھی اس سے متصل ہو وہ اُسے جلائے اور پھونکے۔ ہوا کے لیے یہ مقدر ہے کہ وہ ذراتِ عالم کو اڑائے اور پھیلائے۔ مٹی کے لیے یہ صورت مقدر ہے کہ وہ ہر چیز کو کھینچے اور بٹھائے اور جب کوئی مادّہ اس کے گلے لگے تو اس کو گلائے اور چھپائے۔ نیز بارش کے برسنے پر ہر ایک تخم ریزی کے موافق اپنے جوہر کو اپنی پشت پہ دکھلائے اور اس میں نمو پیدا کرے۔

تقدیراتِ اوصافی :-

عادات و خصائل اور اوصاف و ملکات میں بھی یہی صورت جاری ہے مثلاً سخاوت کے لیے کاتبِ تقدیر نے یہ لکھ دیا ہے کہ وہ اپنا دل جگر تک نکال کر دوسروں کے نذر کر دے۔ بخل کی تقدیر یہ لکھی گئی ہے کہ وہ ہر چیز سے اپنے قبضہ و گرفت کو نہ ہٹائے۔

تقدیراتِ قواءِ انسانی

قوائے بشریہ کی تقدیرات کو دیکھیے تو وہاں بھی قصہ نظر آتا ہے۔ ملکیت کے لیے کاتبِ تقدیر نے اگر نورانیت کو لازم ٹھہرا دیا ہے تو بہیمیت کے لیے اسی نے صفحاتِ دل پر ظلمت و تاریکی کو "کلکِ قدرت" سے لکھ دیا ہے۔ سبعیت و درندگی کے لیے اگر اس نے جور و بے رحمی اور ظلم و جبر کو لکھ دیا ہے تو نفسانیت و بشریت کے لیے اس نے ناریت کو لالچ و خود غرضی و انانیت کی صورت سے لازم کر دیا ہے اور ان تمام قوتوں کو گھٹانے اور بڑھانے کا اختیار انسان کے کسب و عمل پر موقوف ٹھہرا

ہے چنانچہ انسان اگر اپنے قصد و اختیار سے اپنی کسی قوت کو غلط مصرف میں صرف کرتا ہے تو اس کے لیے حکمِ تقدیر یہ ہوتا ہے کہ وہ دنیا میں عاجز و درماندہ رہے اور اگر وہ اپنی قوتوں کو اس عالمِ تکلیف میں میانہ روی کے ساتھ صحیح مصرف میں صرف کرتا ہے اور ان سے صحیح طور پہ کام لیتا ہے تو اس کے لیے تقدیرِ الٰہی کا فیصلہ یہ ہوتا ہے کہ وہ دنیا میں کامیاب و سربلند ہو گا۔ پس آگ کا جلانا، پانی کا بہانا، ہوا کا اڑانا، مٹی کا گلانا۔ بارش کا اگانا یہ سب تقدیراتِ الٰہیہ ہیں۔ جن سے انسان عقل و بے وقوفی کی راہ سے نفع نقصان حاصل کیا کرتا ہے۔ پس انسان جہاں تقدیر سے مجبور ہے وہاں ہمارے نزدیک وہ تدبیر کرنے پہ بھی مجبور ہے اسی مضمون کو ذیل کی ایک روایت سے بخوبی ذہن نشین فرمائیے۔

حضرتِ عمرؓ نے تقدیر کا مفہوم کیا سمجھا ؟

عبداللہ بن عباسؓ سے روایت ہے کہ فاروقِ اعظم بسلسلہ سفرِ شام جب مقامِ سرغ میں پہنچے اور وہاں آپ نے شام کی وبا کا حال سنا تو واپسی کا ارادہ فرمایا۔ حضرت ابوعبیدہ بن الجراح نے عرض کیا امیر المومنین کیا آپ تقدیرِ الٰہی سے بھاگتے ہیں فاروقِ اعظم نے فرمایا نعم نفر من قدر اللہ الی قدر اللہ بے شک ہم اللہ کی ایک تقدیر (موت) سے دوسری تقدیر (حیات) کی طرف بھاگنا چاہتے ہیں اور اس کے بعد فرمایا کہ اس کی مثال ایسی ہی ہے جیسے تمہارے پاس اونٹ ہوں اور تم ایسے میدان میں جا پہنچو جس کی ایک جانب خشکی ہو اور دوسری جانب سبزہ ہو تو اس وقت تمہیں یہ اختیار ہوتا ہے کہ چاہے تو اپنے اونٹوں کو خشکی میں چرا لے اور چاہے تو سبزہ

میں چراۓ لیکن بہر دصورت تم تقدیرِ الٰہی سے کس طرح سے بھی باہر نہیں ہو سکتے ۔
یہی صورت ہماری ہے ہم کو چاہیئے کہ ہم اللہ کی ان تقدیرات کی طرف اپنے اختیارِ
وعمل سے متوجہ ہوں جن سے اس کی رحمتِ بے پایاں ہمیں برکت دیتی ہے ان تقدیر
غضب کی طرف نہ جائیں جو ہمیں ہلاکت و فلاکت کی طرف لے جائیں.

اس روایت سے واضح ہے کہ انسان تقدیراتِ الٰہیہ کی طرف بھاگنے پر تو مجبور
ہے لیکن اختتامِ عمر تک اس کی خود اپنی سعی بھی ہونی چاہیئے کہ وہ اچھی تقدیرات
کی طرف اپنے کو لے جانے کی سعی کرے یہ علیحدہ بات ہے کہ اس میں کامیابی ہو یا نہ
ہو چنانچہ دیکھو جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا وقت رحلت آپہنچا تو پھر ان کی تقدیرِ
حیات نے بھی تقدیرِ موت کے آگے سپر ڈال دی ۔

تقدیر مانعِ تدبیر وعمل نہیں

پس عقیدہ تقدیر کا یہ اثر لے لینا کہ ترکِ عمل اور ترکِ سعی بھی ہو یہ ہرگز محمود
و مستحسن نہیں ہے ایک شخص اگر بیمار ہو جائے تو اس پر علاج فرض ہو جاتا ہے
حالانکہ اگر اس کا وقت آپہنچا ہے تو وہ ضرور فنا ہو کر رہتا ہے لیکن چوں کہ
تقدیر کا علم کسی کو نہیں دیا گیا ۔ اس لیے تدبیرِ علاج کو بصورت ضروری قرار دیا
گیا ہے چنانچہ اگر موت کا وقت نہیں آتا تو بصورتِ علاج صحیح اس مرض سے
صحت کا واپس آجانا یقینی ہو جاتا ہے اور اگر وقت برابر ہو جاتا ہے تو تکلیف
میں کمی ہو جاتی ہے ۔

غرض یہ عقیدہ دل میں جما بیٹھنا کہ جو منظورِ خدا ہوتا ہے وہی ہو کر رہتا ہے
اور ہم کچھ کریں یا نہ کریں یہ صحیح نہیں ہے ۔

ہماری نافہمی ہمارے لیے مضر ہو رہی ہے

بلا غور سے دیکھیے تو اس عقیدہ کے حق ہونے کے باوجود اس کا یہ غلط
استعمال خدا کے عطا کردہ اختیار و قدرت کو معاذ اللہ بے کار و بے مقصد ٹھہرا
دینے والا ہے اور نورِ عقل اور اس کے تصرفات اور تکلیف احکام کے سارے
نظام کو باطل قرار دینے والا ہے جب کہ ہمیں سعی و تکلیف کا حکم دیا گیا ہے
اور اس عالم میں زیادہ سے زیادہ حسنات و برکات حاصل کرنے کی تاکید فرماتے
ہوئے نتیجہ کو حق تعالیٰ نے بہرصورت اپنے قبضہ میں رکھا ہے ہاں بکمالِ شفقت
و رحمت اسی کے ساتھ ساتھ ہم کو ہماری کاوشوں اور محنتوں کے صلہ سے محروم
نہ کیے جانے کی خوشخبری سنا کر اس کی طرف سے یہ وعدہ بھی دیا گیا ہے کہ حق
تعالیٰ اہلِ احسان و تکلیف کے اجر و صلہ کو کبھی ضائع نہیں فرماتا تو اس کے بعد
یہ ہمارے نفس کا دھوکہ نہیں تو اور کیا ہے کہ ہم تکلیف و عمل سے جان چرانے
کے لیے تسلیم و رضا، صبر و قناعت اور توکل کا غلط مفہوم دل میں جماتے ہوئے
ان کی آڑ لے کر اپنی کم ہمتی و بے عملی کو ان پاکیزہ عنوانوں میں چھپائیں اور وہ
تمام نعمتیں جو ہمارے کسب و عمل پر موقوف رکھی گئی ہیں ہم ان سے اپنے کو
محروم بنالیں نیز جب ہماری بے عملی و سہل انگاری کم ہمتی و پست خیالی کے برے
نتائج ہمارے سامنے آئیں تو بجائے اس کے کہ ہم اپنی غلطیوں پر نادم ہو کر اپنے
اصلی مرض کا کھوج لگائیں الٹا یہ کریں کہ اپنی بے عملی کے ان نتائج کو بھی خدا کے

ذمہ تھوپ دیں کہ صاحب ہم کیا کرسکتے ہیں ہمارے مقدر میں یہی لکھا تھا اس لیے ہم اس حالت کو پہنچنے پر مجبور تھے؟ اس کا تو یہ مطلب نکلتا ہے کہ نہ ہمیں خدا نے اپنے نفع نقصان کے سمجھنے کی قوت دی تھی نہ ہمیں خیر و شر میں خیر کو اختیار کرنے کا حق ہی دیا تھا نہ ہمیں اس نے علم و عقل اور قوت عملی ہی عنایت کی تھی حالاں کہ یہ خدا پر سراسر ایک کھلا ہوا بہتان ہے جس سے یقیناً وہ بری ہے ہم بھی کہتے ہیں کہ بے عملوں کی تقدیر میں ناکامیاں ہی لکھی ہوئی ہیں لیکن ہم اس کو نہیں مانتے کہ خدا نے تم کو عمل کی قوت نہیں بخشی ہے تم اگر اس قوت کو خود ضائع کردو تو اس میں قدرت کا کیا قصور نکالا جا سکتا ہے ؎

گر نہ بیند بروز شپرہ چشم   چشمۂ آفتاب را چہ گناہ

کیا ہم اپنی ضرورتوں میں بھی تقدیر پر بھروسہ کرتے ہیں!

کیا ہم اپنی روزمرہ کی ضرورتوں اور حاجتوں میں بھی اسی طرح توکل سے کام لیتے ہیں جیسے محنت و مشقت تجارت و صنعت جیسے امور میں جان چرانے کی وجہ سے ان کی آڑ لیتے ہیں ہم نے کسی کو نہیں دیکھا کہ جب اس کو بھوک اور پیاس ستانے لگتی ہے تو اپنی پیاس بجھانے کے لیے اسے کنویں پر جاکر ڈول اور رسی کی فکر نہیں ہوتی اور بھوک رفع کرنے کے لیے ہانڈی چولہے کی لگن نہیں لگتی. کیا ایسے اوقات میں بھی کوئی تقدیر یا اور توکل پر بھروسہ کرکے بیٹھ جاتا ہے ہاں جب کمانے اور محنت کرنے دنیا میں تکلیف اٹھا کر سربلند ہونے کے موقعے آتے ہیں جن میں سب سے پہلے اپنی نفسانی خواہشات کو پامال کرنے کا سوال سامنے آتا ہے اور اپنی

ت کی اجتماعی عزت کو پیدا کرنے کے لیے جان و مال کی بازیاں لگا دینے کی باری آتی ہے تو ہم ایسے اوقات میں اپنی بزدلی و نفس پرستی کی بدولت اور بخل طبعی و آرام طلبی کی خاطر توکل اور تقدیر و قناعت کی آڑ لینے لگتے ہیں حالانکہ توکل کا حقیقی مفہوم یہ ہے کہ جد و جہد و عمل کا پورا حق کرکے نتیجہ کو خدا پہ چھوڑ دیا جائے۔

مایوسی کفر ہے :-

صد حسرت کہ ہماری بے عملی و بدعقیدگی نے ہماری نوبت یہاں تک پہنچا دی ہے کہ جو قوم کل تک دنیا کو درسِ حکمت دینے والی تھی آج وہ اپنے جہل اور حماقت کی بدولت ان سے سبق تک لینے کے قابل نہیں رہ گئی ہے ہماری حالتِ زار یہ ہے کہ جب بھی کسی ترقی اور امر مہم کو سر کرنے کا وقت آتا ہے تو ہم یہ کہہ کر کنارہ کش ہو جاتے ہیں کہ اب ظہور مہدی سے پہلے مسلمانوں کا ابھرنا ہی محال ہے۔ تدبیر کیا چیز ہے اصل تقدیر ہے جب ہمارا مقدر ہی خراب ہے تو بھلا پھر وہ کیسے سیدھا ہو سکتا ہے حالانکہ یہ تسلیم کرتے ہوئے کہ ظہور مہدی کے وقت اسلام کو عالمگیر رفعت و برتری حاصل ہوگی ہم اس عقیدہ کو سرتاسر غلط سمجھتے ہیں کہ ظہور مہدی سے پہلے مسلمان اپنے تمام قوائے فکر و عمل کو معطل کرکے بیٹھ جائیں اور مایوسی کا شکار ہو کر اپنے ابھرنے کی کوشش ہی نہ کریں قرآن کریم نے ایسے ہی غلط عقیدہ رکھنے والوں کو بہانگِ دہل یہ نصیحت فرمائی ہے۔

لا تیئسوا من روح اللہ انہ
لا ییئس من روح اللہ الا

اللہ کی رحمت سے کسی مرحلہ پر بھی مایوس
نہ ہوں کہ مایوسی کفر ہے جو لوگ ایمان

القوم الکافرون ٥ بالعمل و ایمان بالنتائج نہیں رکھتے
فی الحقیقت وہی لوگ اللہ سے ناامید
رہتے ہیں۔

تدابیر پیغمبر اور ان کے نتائج صالحہ

خود جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مقدس حالات زندگی میں غور کیجیے
تو آپ کو نظر آئے گا کہ حضور نے اپنی زندگی کے ہر ایک دور میں مصلحت و دور اندیشی
تدبیر و حکمت عملی سے کام لے کر خدا کے دین کو بڑی کامیابی کے ساتھ ہم تک
پہنچایا ہے آپ کا کوئی قدم بھی حکمت و تدبیر کے بغیر نہ اٹھتا تھا حضور سرور عالم صلی
اللہ علیہ وسلم باوجود یکہ جیسے آخری دور نبوت میں بہادر اور جری تھے ویسے ہی
ابتدائی دور نبوت میں بھی اپنی جان و مال کو خدائے قادر و توانا کے لیے وقف فرمائے
ہوئے تھے مگر خلاف موقع و محل کسی کام کو نہ کرنے کی مبارک عادت کی وجہ سے جب
تک مسلمانوں کو مکہ میں قوت حاصل نہ ہو گئی اس وقت تک آپ ابتدائی دور میں
گھر ہی میں چھپ کر نمازیں ادا فرماتے تھے اس پر بھی جب مشرکین مکہ نے آپ کو
بہت زیادہ ستایا تو آپ نے طائف کی طرف ہجرت کا ارادہ فرمایا گو وہاں آپ کو
نہ رہنے دیا گیا یہ مصلحت اور تدبیر و حکمت عملی ہی تھی جو آپ نے ایسا کیا آپ بھی
تو اس وقت معاذ اللہ ہاتھ پہ ہاتھ رکھ کر خالی بیٹھ سکتے تھے مگر نہیں آپ کے پیش
نظر ہر ہر قدم پہ یہ تھا کہ گو میں خدا کا سچا رسول ہوں اور غیبی قوتیں بھی میری پشت پناہ
ہیں مگر یہ دنیا عالم اسباب ہے یہاں ہر نتیجہ کسی نہ کسی سعی و تدبیر ہی کے روپ میں

ہمت ہار دینا انسانیت کے لیے باعث
اس لیے سعی و عمل سے
ننگ ہے۔ ہوا کرتا ہے اس لیے اکبر مرحوم نے خوب کہا ہے۔ غالباً اسی موقعہ کے لیے اکبر مرحوم نے خوب کہا ہے۔

نرم دل ہے زمانہ نے تمہیں — مرد وہ ہیں جو زمانہ کو بدل دیتے ہیں
تم کیا اس پہ جو بدلا ہے زمانہ نے تمہیں

اسی زمانہ میں جب مدینہ طیبہ سے بارہ شخص اسلام قبول کرنے کے لیے مکہ میں
آئے تو آپ نے ان کو ارکان اسلام کی تعلیم و تلقین فرمانے کے ساتھ ہی ہجرت مدینہ
کے خیال سے ان سے اس بات پہ بھی بیعت لی کہ وہ مدینہ میں آپ کے تشریف
لے جانے پر آپ کی جان و مال کی حفاظت برابر کریں گے اور
ہر طرح سے آپ کے مددگار رہیں گے۔ یہ سعی و تدبیر اور مآل اندیشی و دور بینی نہیں
تھی تو کیا تھی۔ کیا آپ کو تقدیر الٰہی پہ بھروسہ نہ تھا لیکن آپ نے اس کو حق سمجھتے ہوئے
کبھی جد و جہد میں کمی نہیں فرمائی۔ پھر جب آپ نے مدینہ کی طرف ہجرت کا ارادہ
فرمایا تو از راہ دانشمندی ہر کس و ناکس کو اپنے اس ارادہ کی پہلے سے اطلاع نہ کی بلکہ
سب سے پہلے اپنے چچا حضرت عباس رضی اللہ عنہ سے رازداری کا عہد لے کر اپنا
یہ راز ان پہ ظاہر فرمایا حضرت عباس رضی اللہ عنہ چونکہ بڑے تجربہ کار اور عقلمند بزرگ
تھے اور حضرت کے سچے بہی خواہ بھی تھے اس لیے حضرت عباس نے رسول اللہ
صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ مشورہ دیا کہ صرف بارہ آدمیوں کے بھروسہ پہ غیر جگہ جانا مناسب
نہیں پہلے اپنے کسی معتبر عزیز کو بھیج کر مدینہ کی طرف سے کافی اطمینان حاصل کر لو
پھر جانے کا ارادہ کرو۔ آپ نے اس مشورہ کو پسند فرمایا چنانچہ حضور نے اپنے
چچازاد بھائی مصعب بن ہاشم کو مدینہ کے ان بارہ شخصوں کے ساتھ روانہ کیا جب
ایک سال کے عرصہ میں مدینہ کے لوگ کثرت سے مشرف باسلام ہو گئے اور حضرت

مصعبؓ اسّی سردارانِ مدینہ کو ہمراہ لے کر مکہ آئے تو اس وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سرداران مدینہ سے بھی اس بات پر بھی بیعت لی کہ وہ بسلسلہ امداد نبوت اپنی جان ومال سے دریغ نہ کریں گے اور آپ کی حفاظت اپنی جان کی برابر کریں گے۔ یہ عہد بھی لیا کہ جب دشمنوں سے لڑنے کا موقع آئے گا تو وقت ضرورت وہ اپنی جان اور مال بھی اسلام پر تصدق کریں گے۔ پھر جب آپ نے مدینہ طیبہ کی طرف ہجرت کی تو حضرت علی رضی اللہ عنہ اپنی خواب گاہ پر سلایا اور خود چھپ کر حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے مکان پر تشریف لے گئے۔ تھوڑی سی رات گزرنے پر اسی یارِ غار کو ہمراہ غارِ ثور میں جاکر چھپے۔ مزید احتیاط یہ کی گئی کہ صدیق اکبر نے حضور کو اپنے کاندھے پر چڑھایا تاکہ آپ کے دشمن آپ کا نشان قدم بھی نہ پہچان سکیں۔

کیا یہ سب تدابیر حکیمانہ نہ تھیں جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے رفیقُ الغار نے اختیار فرمائیں؟ پھر مدینہ پہنچ کر مشرکین مکہ کے حالات سے باخبر رہنے کی پوری پوری جدوجہد کرنا کیا آپ کی دوربینی کو ظاہر نہیں کرتا۔ اگر حضور بھی معاذ اللہ تمہاری طرح تقدیر و توکل کا غلط مفہوم دل میں جما کر اپنے قوائے فکر وعمل کو سرد اور بیکار کر ڈالتے اور مدینہ پہنچ کر خدا کے نام پر رہ کر صرف تسبیح وتہلیل ہی میں مشغول رہتے تو کیا جو سربلندی اسلام کو تیئیس برس کے قلیل عرصہ میں سرفروشانہ و جانبازانہ جدوجہد سے حاصل ہوئی وہ عالم اسباب میں بغیر کسی تدبیر کے حاصل ہوسکتی تھی؟

بسلسلہ غزوات اسلامی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ہتھیار زیب بدن فرمانا۔ خود پہننا غزوہ خندق میں اپنے لشکر کی حفاظت کے لیے خندق کھدوانا۔ صلح حدیبیہ کے وقت

اشاعت اسلام کی خاطر اہل مکہ سے دب کر صلح فرلینا اور بغیر فرمالینا اور مدینہ واپس ہوجانا۔ اس صلح کو فتح مبین ظاہر کرنا۔ جنگ احد میں میدان قتال کی ایک گھاٹی پر پچاس تیر اندازوں کو یہ کہہ کر تعینات فرمانا کہ خواہ کچھ بھی صورت حال ہو مگر تم یہیں جمے رہنا۔ تمہارا کام صرف یہ ہوگا کہ اگر اس راہ سے دشمن حملہ آور ہو تو تم ان پر تیر اندازی کر کے ان کو اس گھاٹی سے پسپا کر دو گے مگر ان تیر اندازوں نے لشکر اسلام کے غالب ہو جانے پر یہ سمجھتے ہوئے کہ اب تو اہل اسلام نے میدان سر کر لیا ہے اس گھاٹی پر سے ہٹ جانا جس کے نتیجہ میں فتح اسلام کا مبدل بہ شکست ہو جانا کیا یہ سب امور تدبیر و حکمت ہی کا نتیجہ نہ تھے جب حق تعالیٰ نے جنگ احد میں اپنے محبوب صلی اللہ علیہ وسلم کو ہر دنیا و مافیہا سے زیادہ محبوب رکھنے کے عالم تکلیف و عمل کا پابند رکھا اور چند اہل اسلام کی سوء تدبیر کے نتیجہ میں حضور کا زخمی ہونا گوارا فرمایا مگر اپنے قانون کو توڑنا پسند نہ فرمایا تو آج کے بے عمل بے سرے کاہل الوجود مسلمانوں کو سوچنا چاہیئے کہ وہ کس برتے پر کب تک اپنی غفلتوں اور بے تدبیریوں کو نباہ سکیں گے اور اپنی موجودہ زبوں حالی کے باقی ہوتے ہوئے کیوں کر بامِ عروج پر پہنچ سکیں گے۔

پھر اس کے آگے ذرا ایک قدم بڑھایئے تو معلوم ہوگا کہ انصار و مہاجرین کے درمیان رشتہ الفت قائم کراتے ہوئے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک انصاری اور ایک مہاجر کے درمیان ان کی مناسبت ہائے طبعی کے زیر نظر ان میں بھائی چارہ کرانا جس کے نتیجہ میں کچھ ہی روز کے بعد مہاجرین کی مالی حالت درست ہو گئی یہ ایک درماندہ قوم کو ابھارنے کی جدوجہد نہیں تھی تو کیا تھی؟

حضور سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا اصحاب صفہ کو قرآن کریم کی تعلیم دینا اور اپنے

فیض صحبت سے ان کے دلوں کا تزکیہ فرمایا ۔ سلاطین اسلام کو اسلام کی دعوت دینے کے لیے اپنے صحابہ کو مختلف زبانوں کے سیکھنے کا حکم فرمایا ۔ کیا یہ سب امور حکیمانہ حکمت و تدبیر کے اعلیٰ منازل نہ تھے جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اختیار فرمائے ۔

ترک تدبیر و ترک دنیا اسلام نہیں رہبانیت ہے

یہ چند واقعات نبوی بطور مشتے نمونہ از خروارے اس لیے عرض کیے گئے ۔ تاکہ ہماری بے حس قوم کی آنکھیں اور ہماری بے عمل قوم کو اندازہ ہو سکے کہ وہ اپنے غلط تخیلات کی بدولت آج ذلت و ناکامی کے کس خطرناک مرحلہ پر پہنچ چکی ہے ۔ کان کھول کر سن لو ! اس وقت جو حالت تمہاری ہے اور ترک دنیا و ترک تدبیر کے جو مہلک سبق تم کو یاد ہو گئے ہیں یا یاد کرائے ہیں یہ رہبانیت ہے اسلام نہیں ہے ۔ اسلام تو یہ ہے کہ دنیا بھی تمہاری حسین ہو اور آخرت بھی تمہاری مکمل ہو دنیا میں بھی تم سربلند نظر آؤ اور آخرت میں بھی اپنی جامع زندگی کے سبب سے حقیقی معنی میں خیر الامم کے مصداق بنو ۔

ایک شبہ اور اس کا ازالہ

جب کہ اہل سنت والجماعت کا عقیدہ یہ ہے کہ بندہ کا ہر کام اللہ کی مشیت کے ماتحت ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ کو ازل ہی سے اس کا علم تھا کہ میرا فلاں بندہ فلاں گناہ کریگا اور فلاں بندہ نیکی کرے گا ۔ پس ایسی صورت میں بندہ کا اختیار کہاں رہا

تو ہر کام جو وہ کر رہا ہے علمِ الٰہی کے موافق اس کے کرنے پہ مجبور ہے ۔

جواب اس کا یہ ہے کہ علمِ الٰہی میں کسی بندہ کے نیک کام کرنے اور کسی کے بُرے کام کرنے سے اس کے اختیار کا سلب لازم نہیں آتا ۔ اللہ تعالیٰ ازل سے یہ علم رکھتا ہے کہ اس کا فلاں بندہ فلاں کام فلاں زمانہ میں فلاں موقع پر فلاں وقت اپنے اختیار سے کرے گا ۔ اور فلاں کام اپنے اختیار سے نہیں کرے گا ۔ اس کی مثال ایسی سمجھو کہ ہم اپنے کسی نوکر سے کسی کام کے کرانے کا ارادہ کریں تو اس شکل میں اگرچہ ہمارا نوکر ہمارے ارادے کے موافق ہمارے کام کو سرانجام دے گا جس کا ہمیں علم بھی ہو گا لیکن ہمارا نوکر ہمارے سپرد شدہ کام کو کرے گا اپنے ہی ارادہ و اختیار سے ، اس لیے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ ہمارے نوکر نے اینٹ اور پتھر کی طرح سے بے اختیار رہ کر محض ہمارے کہنے سے کوئی حرکت کی ہے بس اسی کا نام تقدیر ہے خدا کا کسی کام کے لیے ارادہ کر لینا اور اس کو ایک خاص اندازہ کے موافق بنانا تقدیر ہے اور اسی کام کو اپنی عقل اور اپنے اختیار سے کرنا کسب ہے جس کا خالق اللہ ہے اور سبب بندہ ہے ۔

آج جو مصیبت تم پر بے عملی و بدعقیدگی کی طاری ہے وہ تمہارے ہی ہاتھوں کی پیداوار ہے اگر تم زراعت و تجارت صنعت و حرفت میں ترقی یافتہ ہوتے اور تمہاری دنیا تمہیں حوائجات ضروریہ سے فارغ کیے ہوئے ہوتی تو واقعۃً پھر تم اپنی آئندہ نسلوں کی اور اپنے دین کی بھی کوئی اعلیٰ خدمت کر سکتے تم ہزاروں انجمنیں بناتے ہو مگر میں نے کسی انجمن کا پروگرام نہ دیکھا کہ وہ اپنے شہر کے لوگوں کی اقتصادی حالت کو درست کرنے کے لیے مسلمانوں میں بھی بھائی چارہ قائم کر کے ان کو سرکار

کرانے کی کوشش میں دن رات منہمک ہو ۔ اس موقع پر مضمونِ تقدیر کے لیے احقر کے جذبات نے جو منظم صورت اختیار کی اور چند اشعار زبانِ قلم پر آ گئے مناسب ہے کہ ان کا کیف بھی لیتے چلئے ۔

کیفیاتِ جبر و قدر

جنوں سے عقل کی باتیں کرائیں ؛ خرد سے عشق کے نقشے جمائیں
مٹا کر جبر کو پھر قدر سے ہم ؛ کنارے عقل کا بیڑا لگائیں
دکھائیں جہل کو پھر علم کی راہ ؛ ہر اک ظلمت کو ہم دل سے مٹائیں
کریں حاصل فنا سے گر بقا کو ؛ تو پھر باطل سے بھی ہم حق کو پائیں
کثافت میں لطافت دیکھ کر ہم ؛ نہ کیوں پھر کفر سے اسلام لائیں
فراق و وصل سے بیگانہ ہو کر ؛ سبق ظاہر کو باطن کا پڑھائیں
لگن اتنی تو ہو ہم کو خدا سے ؛ کہ اس کے نام پر ہر شے لٹائیں
دفورِ جذب سے گر قصۂ قدر ؛ سنے کوئی تو ہم بھی کچھ سنائیں
اگر ہو سایۂ رحمت میسر ؛ تو پھر مشکل کو آساں کر دکھائیں
کیا وحدت نے جب کثرت میں جلوہ ؛ تو پھر سوجھیں تمیز کو ادائیں
جنابِ حق کا منشاء تھا ازل سے ؛ کہ وہ اضداد کی محفل رچائیں
ظہور ان کا ہوا نوعِ بشر میں ؛ لیا گھیر اس کو خاصا دائیں بائیں
لکھی تقدیر یہ قلبِ زمیں پر ؛ بشر اضداد کو دکھلائے جائیں

بنا لی ساخت کچھ ایسی ہماری ؛ کہ ہر ضد سے شگوفے ہم کھلائیں
بنائیں اپنی تکلیفوں کو راحت ؛ عمل سے فکر اپنے خود تراشیں
یہی قسمت بنی جن و بشر کی ؛ کہ وہ تکلیف سے راحت کو پائیں
عمل آئینہ تدبیر ہے جب ؛ تو پھر تقدیر سے کیوں خوف کھائیں
وہی تقدیر ظاہر ہو گی ہم سے ؛ عمل سے جیسے دنیا ہم بنائیں
نہ تو مجبور کہتا ہے نہ مختار ؛ یہ اے واعظ تری ہیں کیا ادائیں
اگر تدبیر بھی بے چارگی ہے ؛ نہ کیوں پھر عجز سے قدرت کو لائیں
دکھاتی ہے سمجھ اپنا اثر جب ؛ عمل کی روح جب اس کو لائیں
عمل کے واسطے ہے قدر لازم ؛ جسے ہم خود گھٹائیں یا بڑھائیں
سمجھ پیمانہ روحِ عمل ہے ، ؛ نتیجہ پھل ہے جو ہم حق سے پائیں
رسائی عقل کی اس پہ ہے موقوف ؛ کہ ہم اس کو سدا قرآں دکھائیں
کریں مشغول پھر اس کو جہاں میں ؛ ہر اک انجام کی حجت بنائیں
انہی کو ضامنِ اضداد کہیے ، ؛ یہی رحمت کی ہیں دوہری قبائیں
جو ہو حاصل تجھے قرآن و دانش ؛ سدا پھر گیت تیرے گائے جائیں
عمل سے کرتی ہے جو توہم اعراض ؛ نہیں رکھتیں اثر اس کی دعائیں
جمود اور عقل میں ہے بیر زاہد[1] ؛ بتا پھر کیسے ہم تجھ کو نبھائیں
نہیں ہے ہم کو واعظ[2] کی ضرورت ؛ جہاں میں وعظ کی ہیں جو دوائیں

---

۱ مراد زاہدِ خشک ۔ ۲ مراد پیشہ ور واعظ ہیں ۔

اگر اس وعظ سے ہوں بہرہ ور ہم
گناہوں سے یہ دنیا پاک ہو جب
یہ امت جب ترقی کرے گی ،
روایات سلف جب ہونگی زندہ

تو نا ممکن ہے ذلت خود سے پائیں
کہ ہر مظلوم کا حق ہم دلائیں
کہ ہوں حکمت سے واقف اسکی مائیں
کہ وہ ماضی سے مستقبل بنائیں

دنیا نتائجِ آخرت کی کھیتی ہے

حقیقت یہ ہے کہ دنیا بلحاظ عمل نتائجِ آخرت کے لیے بمنزلہ ایک کھیتی ہے جیسے عمل کوئی یہاں کرتا ہے ویسے ہی نتائج کل اس کے آگے ہیں اگر کوئی یہاں جو بوتا ہے تو گیہوں نہیں کاٹتا ۔ کانٹے بوتا ہے تو پھول نہیں چنتا ۔ اسلام کی تعلیم کا لب لباب بھی یہی ہے کہ تم ہر سلسلہ میں اچھے اچھے عمل کرو تاکہ ایک طرف تمہاری دنیا کے عمل درست ہو تو دوسری طرف تمہارے دنیا کے نتیجہ بھی کل سرسبز و شاداب ملے ۔ اسلام اپنے حلقہ بگوشوں میں پہلے نورِ ایمان پیدا فرماتا ہے پھر اعمالِ صالحہ پر زور دے کر اس کی قوت عملیہ کو قوت قدرت کی معراج کمال پر لاتا ہے ۔ ابتدائی دور میں وہ بشکل دعوت نمودار ہوتا ہے اور آخری دور میں وہ نظام ملک کی باگ ڈور سنبھالتے ہوئے زمین پر اعلاء کلمۃ اللہ کا پرچم لہراتا ہے ۔

جماعتِ حقہ کی پہچان

ہیں جس طبقہ کی تعلیم سے مسلمان یہ مراتبِ ایمان و شوکت طے کریں وہ ما انا علیہ و اصحابی کے طریقہ پاک پر ہے اور جس طبقہ کی تعلیم سے مسلمان لٹ پٹ کر ایمانہ زندگی بسر کرنے کے خوگر ہو جائیں یا صرف دنیا طلبی کو اپنا مقصود حیات قرار دے کر حرام و حلال تک سے قطع نظر کر لیں وہ طبقہ ما انا علیہ و اصحابی کے طریقہ مبارک سے خارج ہے جس سے ملت اسلامیہ کو بچنا لازم ہے خداوند عالم نے اہل ایمان کے لیے بشرط ایمان و عمل صالح زمین پر اقتدار عطا کرنے کا وعدہ قطعی فرما کر اس حقیقت کو اور بھی مؤکد فرما دیا ہے چنانچہ قرآن کریم کا ارشاد ہے ۔

وعد الله الذين آمنوا منكم وعملوا الصالحات ليستخلفنهم في الارض كما استخلف الذين من قبلهم وليمكنن لهم دينهم الذی ارتضى لهم وليبدلنهم من بعد خوفهم امنا يعبدوننی لا يشركون بی شيئا ومن كفر بعد ذالك فاولئك هم الفاسقون ٥

اللہ تعالیٰ نے تم لوگوں میں سے ان کے ساتھ جو (سچے دل سے) ایمان لائے ہیں اور (ہر شعبہ زندگی میں) جنہوں نے (بکمال دیانت و اعتدال پسندی) اچھے اچھے عمل کیے ہیں (یعنی جنہوں نے اپنی قوتِ علمیہ و عملیہ کو اس عالمِ تکلیف میں چودھویں رات کے چاند کی مانند چمکایا اور بڑھایا ہے) وعدہ فرمایا ہے (جو پتھر کی لکیر سے بھی کہیں زیادہ پختہ اور قطعی ہے) کہ وہ ایسے صاحبان

عزم وعمل کو یقیناً (دولت فرمان روائی بخش کر) ملک میں اپنا خلیفہ بنائے گا اس طرح جیسے ان کے باپ دادوں کو خلیفہ بنایا جو ان سے پہلے تھے اور (ملک و دین کو یک جا جمع کر دینے کی وجہ سے) ان کے دین کو دنیا میں برسرِ اقتدار لا کر جس کو اس نے صاحبانِ عزم وعمل کے لیے پسند فرمایا ہے مضبوطی سے قائم کرے گا اور (ان کی مساعی جانکاہ کو قبول فرما کر ان کے لیے) ان کے خوف کو بھی امن (عظیم الشان نعمت) سے بدل دے گا (جس کا آخری ثمرہ یہ ہے کہ وہ دنیا میں سربلند ہو کر میری جناب میں سربسجود رہتے ہوئے میری ہی بندگی کریں گے نیز میرے ساتھ کسی کو بھی کسی سلسلہ میں شریک (جلال وکمال) نہ ٹھہرائیں گے۔

اس آیت کریمہ سے صاف طور پر واضح ہے کہ اگر ہماری قوتِ علمیہ و قوتِ عملیہ میں آثارِ رشد و صلاح پیدا ہو جائیں تو اس وقت ہم بے شک از روئے وعدۂ خداوندی زمین پر اقتدار حاصل کرنے کے مستحق ہو سکتے ہیں۔

فضل وکمال کی تلاش کرو۔

آج ہم جو باعزت زندگی کو ترس رہے ہیں اور سب قوموں سے مات کھا رہے ہیں اس کی وجہ صرف یہی ہے کہ نہ ہمارے اندر اپنے اسلاف کا سا فضل و کمال ہی موجود ہے نہ ہمارے اندر ہمارے بزرگوں جیسی بین الاقوامی تجارت کی تڑپ اور اس کا سلیقہ ہی باقی ہے جس کی وجہ سے ہمارے اندر بلند حوصلگی بھی پیدا ہوتی تھی اور بوجہ سیاحت عالم ہمیں اطرافِ عالم میں اسلام کو پھیلانے کے مواقع بھی ہاتھ آتے تھے اب نہ ہمارے اندر تزکیہ اخلاق کی نعمت ہی موجود ہے جس نے ہمارے

دشمنوں کو بھی ہمارا گرویدہ بنا دیا تھا اور نہ ہی ہماری مادیت میں وہ صبر و قناعت سے پیدا شدہ حسن و جمال ہی ہے جس کو دیکھ کر غیروں کے دل بھی ہماری طرف کھینچنے لگتے تھے۔

ایک وہ دور تھا کہ دنیا کی مختلف قوموں نے ہماری علمی و عملی برتری کو تسلیم کر لیا تھا نہ صرف ہماری برتری کا اعتراف ہی کیا تھا بلکہ تہذیب و شائستگی اور ہر قسم کے علوم و فنون میں ہم کو اپنا اتالیق بھی مان لیا تھا۔ آج ہماری یہ گت ہے کہ ہمیں دنیا کی قوم بھی منہ لگانا پسند نہیں کرتی۔ ہم جہاں مغلوب ہیں وہاں بھی پسماندہ ہیں اور جہاں غالب ہیں وہاں بھی اپنی غفلت اور بداعمالیوں کے سبب سے بلحاظ انجام عاجز و بے بس ہیں۔

یورپ پر ہمارے اسلاف کا احسان

شیخ احمد زراتی مصری نے اپنی کتاب قرۃ العیون میں لکھا ہے جس کو انہوں نے فرانسیسی زبان سے ترجمہ کیا ہے کہ:۔

"بیشتر صناعیاں جو اہل یورپ میں مروج ہیں وہ مسلمانوں ہی کی جاری کردہ ہیں"

جانڈلون لوٹ لکھتے ہیں:۔

"جن لوگوں نے حکمت و فلسفہ کو دوبارہ زندہ کیا وہ بے شبہ ایشیا کے اہلِ اسلام اور اندلس کے مسلمان ہی تھے"

ہنری لوئس نے تواریخ فلسفہ میں لکھا ہے:۔

"مسلمانوں کی وجہ سے یورپ میں علم اور فلسفہ پہنچا اس امرِ خاص میں یورپ ان کا ممنونِ احسان ہے اور اس سے بھی بڑھ کر احسان عربوں کا یورپ پر یہ ہے کہ ان لوگوں نے علمِ ہندسہ میں اور فن ہیئت و طب میں بڑی کوششیں کیں چنانچہ انہی کی بدولت یہ فنون اسپین سے ہو کر فرنگستان میں پہنچے۔ (آگے چل کر لکھا ہے) فن معماری و انجینئری کو بھی اہل فرنگ نے عربوں سے ہی حاصل کیا تھا جن کی بنائی ہوئی عمارتوں میں بڑی شان اور پاکیزگی نمایاں ہوتی تھی"

راڈویل صاحب قرآن کریم کے ترجمہ انگریزی کے سلسلہ میں لکھتے ہیں:-

"عرب کے سیدھے سادھے بدو مملکتوں کے بانی مبانی بنے اور شہروں کے بنانے والے ہو گئے یہ صرف اسلام ہی کا صدقہ تھا جو یہ مرتبہ اس وحشی قوم کو حاصل ہوا اور یہ تو عربوں کا اور مسلمانوں کا ایک زمانہ دراز تک طغرائے امتیاز تھا کہ وہ مفید و کارآمد چیزوں کو ایک ملک سے دوسرے ملک میں جا کر فروخت کرنے کا خاص اہتمام کیا کرتے تھے۔ اسی طریقہ تجارت میں غور کیا جائے تو صاف نظر آئے گا کہ یہ وہی بین الاقوامی و بین المملکتی اسلوبِ تجارت تھا جو سرتاجِ تجارت و دیانت حضور سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے شام اور مکہ کے درمیان تجارت کا مال لے جا کر اپنی امت کو تجارت کا عظیم الشان عملی سبق دیا تھا۔ کیسی خوش تقدیر تھی وہ قوم جس نے حضور سے ایسے پاکیزہ تعلیمات حاصل کر کے اپنے کو بنا لیا تھا کسی نے خوب کہا ہے ؎

عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی
یہ خاکی اپنی فطرت میں نہ نوری ہے نہ ناری

تذکرۂ اسلاف کے مطالعہ و سماعت کا اہتمام اور اس کے مفید نتائج

آہ! آج ہماری بدعملی کوتاہ بینی غیر مآل اندیشی و بدعقیدگی اس درجہ پہ پہنچ گئی ہے کہ ہمارے اسلاف کے یہ سب زریں کارنامے اور ان کی دینی و دنیوی ترقیات ہمارے لیے خواب و خیال ہو کر رہ گئی ہیں بلکہ سچ پوچھیے تو خواب و خیال میں بھی اب ہمیں یہ باتیں نظر نہیں آتیں۔ کیا ہم اپنی چوپالوں اور روزمرہ کی نشستوں میں بعد مغرب یہ ڈھنگ بھی نہیں ڈال سکتے کہ اس قسم کے اپنے اسلاف کے تاریخی کارناموں کو سن کر اپنے کو ان سے آشنا ہی کرتے رہیں جس کی وجہ سے بہت ممکن ہے ہم میں سے کوئی طبقہ پھر جامع ترقی کا حامل بن کر اپنے اسلاف کی یاد کو تازہ کر دے۔ ایسی منتخب کتابیں تجویز کی جاسکتی ہیں مثلاً:-

قصص القرآن۔ اشاعتِ اسلام۔ شاہنامۂ اسلام۔ مسدس حالی۔ سیرۃ النبی شبلی۔ سیرت خلفائے راشدین۔ سیر الصحابہ۔ حکایاتِ صحابہ۔ اوجز السیر۔ تعلیم الاسلام غزواتِ اسلام، قرآن کریم، مترجمہ شیخ الہند، تفسیر حقانی۔ ترجمہ مشکوۃ شریف، ترجمان القرآن۔ ترجمان السنہ۔

یہ وہ کتابیں ہیں جن سے ہر قسم کی معلومات ہم کو اردو زبان میں حاصل ہوسکتی ہیں جامعہ عثمانیہ کی ترجمہ کی ہوئی مختلف علوم و فنون میں گھر بیٹھے مہارت حاصل ہوسکتی ہے

اگر ہم اردو زبان میں بھی اسلام اور اہل اسلام کا حال معلوم نہیں کر سکتے تو آخر پھر ایسے نام کے اسلام سے کیا فائدہ ہے۔

حالی مرحوم نے مسدس حالی میں بزرگانِ اسلام کا نقشہ خوب ہی کھینچا ہے لیجئے ان کی زبان سے بھی اسی مضمون کو بشکلِ نظم ایک بار پھر سن لیجئے۔ تاکہ جس تڑپ کی تخم ریزی قرآن و سنت کو اپنا راہنما بنا کر ہماری طرف سے دلوں میں کی گئی ہے اسی کی آبیاری مسدس حالی سے ہو کر یہ دردِ دل نتائج کی دنیا میں بار آور ہو جائے حالی مرحوم فرماتے ہیں۔

خدماتِ اسلام کا مرقع منظوم

لیے علم و فن ان سے نصرانیوں نے — کیا کسب اخلاق رومانیوں نے
ادب ان سے سیکھے صفاہانیوں نے — کہا بڑھ کے لبیک یزدانیوں نے

ہر اک دل سے رشتہ جہالت کا توڑا
کوئی گھر نہ دنیا میں تاریک چھوڑا

ارسطو کے مردہ فنوں کو جلایا — فلاطون کو پھر زندہ کر کے دکھایا
ہر اک شہر قریہ کو یوناں بنایا — مزا علم و حکمت کا سب کو چکھایا

کیا برطرف پردہ چشمِ جہاں سے
جگایا زمانہ کو خوابِ گراں سے،

ہر اک میکدہ سے بھرا جا کے ساغر — ہر اک گھاٹ سے آئے سیراب ہو کر
گرے مثل پروانہ ہر روشنی پر — گرہ میں سیا باندھ حکم پیمبرؐ

کہ حکمت کو اک گم شدہ لعل سمجھو
جہاں پاؤ اپنا اُسے مال سمجھو

ہر اک علم کے فن کے جویا ہوئے وہ — ہر اک کام میں سب سے بالا ہوئے وہ
فلاحت میں بے مثل یکتا ہوئے وہ — سیاحت میں مشہورِ دنیا ہوئے وہ

ہر اک ملک میں ان کی پھیلی عمارت
ہر اک قوم نے ان سے سیکھی تجارت

غرض فن ہیں جو مایۂ دین و دولت — طبیعی ریاضی الٰہی و حکمت
طب اور کیمیا ہندسہ و فن ہیئت — سیاست تجارت عمارت فلاحت

لگاؤ گے کھوج ان کا جا کر جہاں تم
نشان ان کے قدموں کے پاؤ گے واں تم

ہمارے اسلاف کی کامیابی کا راز قرآن و تجارت تھا

ہمارے بزرگوں کی ان تمام کامیابیوں کا راز صرف ایک ہی تھا اور وہ یہی کہ انہوں نے اپنی عقلِ نارسا میں رسائی قرآن کریم میں غور و تدبر کر کے پیدا فرمائی اور پھر اپنی عقل مزکی و مصفیٰ سے انہوں نے دین و دنیا کی ہر اک خدمت کا اپنے کو اہل بنا کر حیرت انگیز عملی ترقیات فرمائیں تھیں انہوں نے قرآن کریم کو دنیا و عقبیٰ دونوں کے لیے اپنا راہنما سمجھا تھا اسی لیے وہ دونوں جہاں میں معزز و ممتاز ہوئے۔ ہم کو غور کرنا چاہیے کہ پہلے ہم کیا تھے اور اب کیا بن کر رہ گئے ہیں۔ سچ یہ ہے کہ جس طرح سے خداوند عالم نے ہماری نوع میں فضائل و کمالات کی طرف

غیر متناہی طور پر ترقی کرنے کی استعداد و قابلیت ودیعت کی ہے اسی طرح سے رذائل کے غیر محدود درجات کی طرف تنزل کرنے کی استعداد بھی ہمارے اندر رکھی ہے ہمارے اسلاف نے فضائل میں بے پناہ ترقی کی اور ہم نے ان کے برعکس رذائل میں ترقی کی۔

اپنا نمونہ دیکھنا ہو تو ہمیں طبقہ امراء و علماء کو دیکھ لینا چاہیئے کہ ان میں سے کتنے کام کے ہیں اور کتنے مضرت رساں ہیں اب ہمیں آخری طور سے یہ فیصلہ کر لینا چاہیئے کہ آیا ہم کو ننگ اسلاف و ننگ انسانیت بنتا ہے یا اپنے اسلاف کے کمالات کو پھر اپنے اندر پیدا کر کے فخرِ اسلاف بن کر ان کی یاد کو تازہ کرنا ہے اگر کمالاتِ اسلاف حاصل کرنے کا تہیہ ہے یعنی جو کمال اور جو حکمت جہاں سے ملے بلا کسی جھجک کے اس کو حاصل کر کے ہی دم لینا ہے تو للہ کمر ہمت باندھ کر اٹھو۔ ہر قسم کی ایجادات و ترقیات سے واقفیت اور ان میں کمال پیدا کرو تجارت اور بالخصوص بین المملکتی تجارت کے اصول اور قواعد کا علم حاصل کرنے کے لیے درسگاہیں بناؤ۔ نیز اپنی اقتصادی حالت کو درست کرنے کے ساتھ ساتھ اپنے دین اور اپنی شکل و وضع پر قائم رہتے ہوئے دنیا کی ساری بلندیاں اس لیے حاصل کرو کہ ہر قسم کی سربلندیوں کا جو ازلی و ابدی سرچشمہ ہے۔ ہمیں اس کے آگے جھکنا ہے اور اپنی چند روزہ حیات کو اپنے لیے اور اپنی آئندہ نسلوں کے لیے اور کل بنی نوعِ انسان کے لیے ایک مثال بنانا ہے۔

-۞-

جس قدر عقل بڑھے گی اسی قدر ترقی کیطرف قدم بڑھیگا

یاد رکھو جس قدر زیادہ تمہاری عقل میں جودت اور صلاحیت اور تیزی آئے اسی قدر تمہارے اعمال بھی پر ثمر اور پر نتائج ہوتے چلے جائیں گے اسی قدر ے نصیب اور تمہارا مقدر بھی خوش آیند ہو گا عمل اختیاری ہے نتیجہ غیر اختیاری ے نتیجہ و عمل دو ایسی لازم و ملزوم حقیقتیں ہیں جو کسی حال میں بھی ایک دوسرے ے جدا نہیں ہو سکتیں اس لیے تقدیر پر ایمان کہہ کر اور اس کی بحث جو میں نہ پڑ کر ے پیمانہ عقل و عمل کو بڑھاؤ یہ پیمانہ جتنا بھی بڑھاؤ گے اسی قدر کائنات کی سرداری زیادہ سے زیادہ اہل بنتے چلے جاؤ گے۔

تقدیر کا مفہوم حضرت علیؓ کے ذہن میں

جیسے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا مقولہ مختلف تقدیرات کے سلسلہ میں کشف حقیقت حیثیت رکھتا ہے جس کو ہم نقل کر چکے ہیں اسی طرح تقدیر کے مانع تدبیر نہ ہونے حضرت علی رضی اللہ عنہ کا مقولہ اکسیری نسخہ کی حیثیت لیے ہوئے ہے۔ فرماتے ہیں دو دن کبھی بزدلی نہیں دکھاتا ایک اس روز کہ میں مرنے والا ہوں، دوسرے روز کہ میں مرنے والا نہیں ہوں، مرنے کے دن تو اس لیے بزدلی نہیں کرتا کہ موت تو آج بہرحال آنی ہے پھر بزدلی سے کیا فائدہ ہے اور زندہ رہنے کے ایام اس لیے ہمت نہیں ہارتا کہ موت تو آ نہیں سکتی۔ بزدلی سے کیا فائدہ۔ معلوم ہوا جو لوگ عقیدۂ تقدیر کو تسلیم کرنے سے اس لیے انکار کرتے ہیں کہ ان کے ناقص

خیال میں یہ عقیدہ ہی مسلمانوں کی بحبت و پس ماندگی کا سبب ہے وہ سخت غلطی پر ہیں۔ یہ تقدیر کے بہت بڑے قائل حضرت علی رضی اللہ عنہ تھے لیکن ان کی شجاعت اور ان کے علمی و عملی بے مثال کارناموں میں ذرا بھی تقدیر حائل نہیں ہوئی یہی حال دوسرے حضرات صحابہ کا تھا۔

تقدیر کسی راہ میں حائل نہیں ہوتی ؛

اصل یہ ہے کہ بے عملی بے احساسی، بزدلی اور شجاعت و عزم و عمل یہ سب امور فطری ہیں۔ جو فطرتاً بزدل ہوتا ہے وہ گریز کی تلاش کرتا ہے اور جو بہادر ہوتا ہے وہ فطرتاً بہادری کی راہ پر گامزن ہوتا ہے تقدیر دونوں سلسلوں کے لیے حارج نہیں ہے کمی یہ ہے کہ ہماری عملی زندگی قرآن و سنت رسول اللہ کے موافق نہیں اگر بنتی بھی ہے تو صرف نماز روزہ کی حد تک بنتی ہے حالانکہ جہاد و قربانی تاسیس و قیام بیت المال نصب قضا، و نصب امیر و اجرائے حدود شرعیہ یہ وہ مراتب عبادت ہیں جن کو حاصل کرنے کی جد و جہد ہم پر واجب ٹھہرائی گئی ہے اور بقدر استطاعت جتنا بھی ہم ان پر عمل کریں عمل کرنا فلاح دارین کے لیے ضروری ہے اسی لیے جہاں بالکلیہ ایسے امور پر عمل کا موقع نہ ملے تو وہاں سے ہجرت تبلائی گئی ہے یہی حقیقی مفہوم عبادت ہے جو اپنی تمام جہتوں پر مشتمل ہے جسمانی عبادت مثل رکوع و سجود کا ایک حصہ ہیں کلی عبادات نہیں۔ عبادت کے مفہوم میں وہ تمام امور حسنہ داخل ہیں جو اپنی ذات سے لے کر اپنے خاندان اور اپنی قوم اور اپنی نوع کی بہی خواہی کے لیے عمل میں لائے جاویں جنت انہی صاحبان عزم و عمل کا حصہ ہے جنہوں نے

اپنی جان اور اپنے مال کو خدا کی .... رضامندی حاصل کرنے کے لیے تج دینے کا عہد کیا ہے جنت ان خدا کے صالح اور نیک بندوں کا ٹھکانہ ہے جو اللہ و رسول ؐ کے احکام کی تعمیل میں سربکف ہو کر اسلام کی سربلندی کے لیے اپنی زندگیاں وقف کر دیتے ہیں اور ادائے حقوق و دستگیری خلق میں جو لوگ چست و چالاک ہوتے ہیں اور عزم و عمل سے اپنی تقدیریں پلٹ کر رکھ دیتے ہیں حقیقت یہ ہے کہ تدبیر کی راہ سے اپنے لیے اچھی سے اچھی تقدیرات کا حاصل کرنا ہی اس دنیا میں سب سے بڑی سعادت اور سب سے بڑا کمال ہے۔

مضمون ہذا کے آخر میں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہم چند ایک ایسی آیتیں و حدیثیں بھی نقل کر دیں جن سے تدبیر کی ضرورت اور اس کی اثر اندازی واضح ہوتی ہے تاکہ ہمارا یہ مضمون بہمہ جہت جامع نظر آئے۔

قرآن کریم میں ہے

لہا ماکسبت وعلیہا ما اکتسبت - (بقرہ)	بندہ نے جو کچھ بھی دنیا میں کمایا ہے اس کے نتائج بھی آگے اس سر پڑتے ہیں۔
ما اصابکم من مصیبۃ فبما کسبت اید یکم ویعفوا عن کثیر ہ	جس قدر بھی تم مصیبتیں دنیا میں مول لیتے ہو وہ فی الحقیقت تمہارے ہی ہاتھوں کا کیا دھرا ہوتا ہے اور سچ پوچھیے تو اللہ تو اس پر بھی تمہاری بہت سی خطاؤں سے درگذر فرماتا ہے۔
ان اللہ لا یغیر ما بقوم حتی	اللہ کسی قوم کی حالت نہیں بدلتا جب

يغيروا ما بانفسهم - (رعد)

تک کہ اس کے افراد خود ہی اپنے انفس(وں)
کو نہ بدل ڈالیں۔

* *

ذالك بما قدمت ايديكم
وان الله ليس بظلام للعبيد

خدا کی طرف سے سختیاں تم پر محض تمہارے
ہاتھوں کی پہل کے سبب سے ہوتی
ہیں جو تم خود رائی سے کرتے ہو ورنہ
تو اللہ کسی بندہ کے لیے بھی ظلم کرنے
والا نہیں ہے۔

* *

* *

* *

ذالك بان الله لم يك مغيرا
نعمة انعمها على قوم حتى
يغيروا ما بانفسهم -
(انفال)

یہ سب سختیاں اس لیے ہیں کہ جس نعمت
کا اللہ نے کسی قوم پر انعام فرمایا ہے وہ
ہرگز اس میں اس وقت تک کوئی تغیر
نہیں فرماتا جب تک کہ اس قوم کے
افراد خود ہی نعمتوں کا غلط استعمال کر
کے اپنے نفسوں کو نہ بدل ڈالیں۔

* *

* *

ان احسنتم احسنتم لانفسكم
وان اسأتم فلها - (بنی اسرائیل)

اگر تم نے بھلائی کے لیے کام کیے تو اپنے
ہی لیے کئے۔ اور اگر برائیاں کیں تو بھی
اپنے ہی لیے کیں (جن دونوں کا
اختیار تم کو دیا گیا تھا)

ومن اراد الآخرة وسعى لها
سعيها وهو مومن فاولئك
كان سعيهم مشكورا ط
(بنی اسرائیل)

جس نے آخرت
کا تہیہ کیا اور اس کے لیے اس دنیا
میں جدوجہد کی جیسا کہ اس کا حق ہے

اور وہ مومن ہے سو ایسے صاحبان
عزم و عمل کی سعی ٹھکانے لگائی جاتی
ہے۔

فاليوم لا تظلم نفس شيئا
ولا تجزون الا ما كنتم تعملون

پس آج کسی شخص پر ذرا بھی ظلم نہ ہوگا
اور تم کو اس کا بدلہ دیا جائے گا جو تم
کرتے تھے۔

ليس للانسان الا ما سعى -
(النجم)

انسان کے لیے کچھ بھی نہیں مگر صرف
وہی جو اس نے عمل کیا۔

حدیث میں ہے -

كان رسول الله صلى الله عليه
وسلم جالسا مع اصحابه ذات
يوم فنظروا الى شاب ذى
جلد وقوة وقد بكر يسعى
فقالوا ويح هذا لو كان
شبابه وجلده فى سبيل
الله فقال صلى الله عليه وسلم
لا تقولوا هذا فانه ان كان
يسعى على نفسه ليكفها عن
المسئلة ويغنيها عن الناس

پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم ایک دن اپنے
صحابہ کے ساتھ تشریف فرما تھے کہ ایک
پھرتیلا گٹھیل جوان صبح صبح محنت کرتا
نظر پڑا۔ اصحاب نے عرض کیا کاش اس کی
جوانی اور طاقت خدا کی راہ میں صرف
ہوتی۔ حضور نے فرمایا یہ مت کہو کیونکہ
اگر یہ شخص اپنے اوپر اس خیال سے
محنت کرتا ہے کہ سوال سے بچے اور
لوگوں سے مستغنی ہو جائے تو وہ یقینا
خدا ہی کی راہ میں ہے اور اگر محنت

فهو في سبيل الله وان كان ليسعى على الابوين ضعيفين او ذرية

کرتا ہے بوڑھے ماں باپ اور بچوں کے لیے نہ ان کی ضرورتیں پوری کرے اور سربراہی کرے تو بھی خدا کی راہ میں ہے۔

ایک اور موقعہ پہ فرمایا۔

ان الله يحب المومن المحترف

بے شک اللہ پیشہ ور مومن کو محبت کی نظر سے دیکھتا ہے۔

دیکھئے ان آیات و احادیث سے صاف طور پہ واضح ہے کہ بندہ کی سعی اثر رکھتی ہے جو اس کے اختیار کو ٹھکانے لگاتی ہے۔ پس مسلمانوں کا محض تقدیر پر جبر و سہ کر کے بیٹھ جانا ان آیات و احادیث کی روشنی میں ہرگز مستحسن نہیں سمجھا جا سکتا۔

عبادات

عقائد نظریہ سے فارغ ہونے کے بعد اب ہم عقائد عملیہ کی روشنی بیان میں لانا چاہتے ہیں لیکن اس سلسلہ میں ہم تفصیل سے کام نہیں لیں گے جس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ :-

ہم عبادت کے مفہوم پر گذشتہ صفحات میں ضمناً کافی روشنی ڈال چکے ہیں۔

دوسرے اس وجہ سے کہ کتب فقہ کا موضوع ہی عبادات و معاملات ہیں

کے جملہ تفصیلی احکام مرتب طور سے ان کتابوں میں ملتے ہیں۔

ی نماز روزہ کے ... یہ بات بھی ہے کہ اکثر مذہبی مجالس وعظ و پند میں مسلمانوں کو نماز ... نمیرے ... زہ کے مسائل کو بارہا سننے کا اتفاق رہتا ہے۔ ناظرین نے غور کیا ہوگا تو ... ہیں اس کا احساس ہوا ہوگا، کہ ہم نے ان مسائل پہ زیادہ زور دینا مناسب ... سمجھا ہے جن سے عوام کے کان کم آشنا ہیں۔ بنابریں امید ہے کہ ہمیں اس سلسلہ ... معذور سمجھا جائے گا اور اس کی تفصیلات کے لیے کتب فقہ کی طرف رجوع ... کیا جائے گا۔

عبادت کی تعریف

عبادت کے معنی بندگی اور غلامی کے ہیں۔ بندہ بھی فی الحقیقت اپنے ... کائنات کا غلام ہی ہے جس کے جان و مال وغیرہ پہ اس کے مالک کو ہر ... م کی تصرفات کا حق حاصل ہے۔ ویسے بندہ کا اصل فریضہ خلقی بھی یہی ہے کہ ... وہ اپنے پیدا کرنیوالے کا مطیع و فرمانبردار رہے اور بندگی زندگی کے ہر شعبہ کی ... طرح نظر آئے۔ اقرار بندگی محض زبان ہی سے نہ ہو بلکہ اس کے ساتھ جسم سے ... اور جان سے مال سے اور متاع سے اولاد سے اور بیوی سے ماحول سے اور ... بیعت سے بھی اعتراف بندگی ہو۔ پس زندگی کے ان تمام سلسلوں میں بلاتفریق ... رنگ و نسل و وطن علماً و عملاً اس کا اعتراف ہی تعریف بندگی ہے پھر عبادت ... اور ہے اور اس کا کیف اور ہے۔ عبادت میں کیف اسی وقت آتا ہے جب ... کسی مرشد کامل کے ہاتھ پہ بیعت توبہ کی توفیق میسر آئے کہ مکی زندگی کی سب

سب سے پہلی سنت یہی ہے۔ جس طرح وضو سے ظاہری طہارت نصیب ہوتی ہے اسی طرح بیعت توبہ سے باطنی طہارت میسر آتی ہے یہ جو ہم نے سمجھ رکھا ہے کہ ہم جو چاہیں کرتے رہیں صرف پانچوں وقت خدا کے دربار میں حاضر ہو جانا کافی ہے یہ تعلیماتِ الٰہیہ کے سراسر خلاف ہے قرآنِ کریم نے ایسے لوگوں کو خبردار فرماکر یہ تنبیہ فرماتے ہوئے ارشاد فرمایا ہے۔

لیس البر ان تولوا وجوھکم قبل المشرق والمغرب ولکن البر من اٰمن باللہ والیوم الاخر والملائکۃ والنبیین واتی المال علی حبہ ذوی القربی والیتامی والمساکین الخ	نیکی یہی نہیں کہ تم اپنے چہرے کو مشرق ومغرب کی طرف کر لیا کرو بلکہ نیکی یہ ہے جو اللہ پر اور آخرت پر ایمان لائے اور فرشتوں اور کتابوں اور پیغمبروں پر اور محبت الٰہی کی بنا پر رشتہ داروں، یتیموں محتاجوں وغیرہ کو مال دے۔ الخ۔

اصلی نماز اور عبادت وہ ہے جو انسان کو امورِ منکر اور ہر قسم کی برائیوں سے بچائے۔ نظر بریں وجوہ پہلا عقیدہ یہ ہے کہ عبادت ہر عاقل بالغ انسان کے لیے ضروری ہے جس کی ابتداء سنِ شعور سے ہونی چاہیے عبادت کی جانی و مالی پانچ شکلیں بھی حق تعالیٰ نے اپنے بندوں کے لیے بذریعہ رسول خود ہی تجویز فرما دی ہیں تاکہ اختلاف عبادت سے ان میں اختلاف مذہب ومشرب کی بنیاد نہ پڑے اسی لیے ان کے علاوہ جو عبادت کے طریقے بندوں نے خود ایجاد کر رکھے ہیں وہ خدا کے یہاں مقبول نہیں ہیں وہ پانچ عبادتیں جن پر اسلام کی بنیاد ہے یہ ہیں:۔

اقرار توحید ورسالت[1]۔ نماز[2]۔ روزہ[3]۔ حج[4]۔ زکوٰۃ[5]

اور جو امور قصرِ اسلامی کو آراستہ وپیراستہ کرتے ہیں اور تکمیل دین کا موجب ہیں وہ بھی پانچ ہیں جو یہ ہیں:۔

ایثار وخلوص نیت[1]۔ دعوت قرآن[2]۔ جہاد[3]۔ ہجرت[4]۔ خلافت[5]۔

اقرار توحید ورسالت اور نماز مکہ میں فرض ہوئے۔ روزہ وزکوٰۃ اور حج مدینہ میں فرض ہوئے۔ اسی طرح سے ہجرت اور دعوت قرآن وایثار مکی زندگی کے نمایاں نقوش ہیں اور جہاد وخلافت مدنی زندگی کا مابہ الامتیاز ہیں۔ پس جو لوگ ان پانچ فرض شدہ بنیادوں پر عبادت کی عمارت کھڑی کرتے ہیں اور واجباتِ خمسہ سے قصرِ دین کو مکمل کرتے ہیں وہ دونوں جہاں میں ہر قسم کی کامیابیوں اور نعمتوں سے بہرہ اندوز ہوتے ہیں اور جو ان سے روگردانی کرتے ہیں وہ دونوں جہاں میں ناکام ونامراد رہتے ہیں جس طرح سے دونوں ہاتھوں کی دس انگلیوں سے جو چیز بھی پکڑ لی جاتی ہے اس کی گرفت نہایت مضبوط ہوتی ہے اسی طرح سے جب یہ فرائضِ خمسہ اور واجباتِ خمسہ عملی دنیا کی زیب وزینت بن جاتے ہیں تو پھر کوئی شیطانی طاقت بھی حق کی طرف آنکھ بھر کر دیکھنے کے قابل نہیں رہتی۔ انہی دس امور سے اہلِ حق ہر قسم کی مادی وروحانی نعمتوں کے مستحق قرار پاتے ہیں اور ہر قسم کی نعمتیں پھر ایسے عاملین حق کے لیے سزاوار ہو جاتی ہیں۔

غور کیجیے تو معلوم ہوگا "اقرار توحید و رسالت" نماز، روزہ، حج اور زکوٰۃ کو علی الترتیب ایثار و خلوص، دعوت قرآن و جہاد، ہجرت و خلافت میں باہم علاقہ مشابہت ہے جب زبان سے انسان خدا کی عظمت و یکتائی کا اور اس کی ازلی ابدی حاکمیت و کبریائی کا اقرار کر لیتا ہے اسی کے ساتھ ساتھ جب جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو آسمانی حکومت کا نائب کہہ لیتا ہے اور حضورؐ کی وفات کے بعد بھی وہ آپ ہی کے جانشین و خلفائے رسالت کو اپنا اولی الامر تسلیم کر لیتا ہے تو اس کے معنی اس کے سوا کیا ہوتے ہیں کہ وہ دنیا کے ہر ایک نظام سے اپنی بے تعلقی کا اعلان کرتے ہوئے صرف اسی ایک آسمانی نظام حکومت کے پابند رہنے کا عہد کرتا ہے ظاہر ہے ایسی صورت میں دنیا کے ہر ایک نظام سے اس کا ٹکرانا ایک قدرتی امر ہوگا۔ یہ مقابلہ بغیر ایثار و سرفروشی خلوص و پامردی کے ممکن نہیں پس اقرار توحید و رسالت کا ایثار و خلوص نیت سے جو ربط خاص ہے وہ محتاج تشریح نہیں۔

دوسرے درجہ میں پھر اسی ایثار و اقرار کا فطری تقاضہ یہ بھی ہوتا ہے کہ جو حلاوت و لذت ہم نماز میں تلاوتِ قرآن سے حاصل کرتے ہیں اس میں بھی ہم بخل سے کام نہ لیں بلکہ اس نعمت سے ہم اپنے دیگر ابنائے جنس کو بھی واقف کریں اس لیے موافقین اسلام کے سامنے آیاتِ قرآنی کا یاد کرانا اور ان کا مطلب سمجھا کر ان پر عمل کرانا مخالفین اسلام کے سامنے آیات قرآنی کی تلاوت کر کے ان کو دعوت قرآن دینا بھی قدرتی طور سے ہمارا دوسرا فرض قرار پاتا ہے سو اس دوسری شکل میں بھی نماز و دعوت قرآن میں جو باہم مناسبت ہے وہ ظاہر

من الشمس ہے جیسے روزہ میں نفس امارہ کی جملہ خواہشات اکل و شرب وغیرہ کا خون کر کے اس کو بھوکا پیاسا رکھ کر پاک کیا جاتا ہے اسی طرح سے جہاد میں بھی اپنی جان کو ہتھیلی پر رکھ کر اور نشہ شہادت میں چور ہو کر اسلام کی سربلندی اور اس کے دفاع کے لیے مقابلین حق اور اعدائے اسلام سے نبرد آزمائی کی جاتی ہے اور بالآخر خون بہا کر زمین کو پاک کیا جاتا ہے یہ روزہ و جہاد کی باہمی مناسبت ہے گویا روزہ میں جمع قوت اور امساکِ خواہش ہوتا ہے اور جہاد میں انہی قوتوں کو حق پر نثار کیا جاتا ہے۔

اسی طرح سے ہجرت و حج میں مناسبت ہے حج میں آدمی کفن بردوش ہو کر اپنے گھر سے نکل کر خدا کے گھر کی راہ لیتا ہے اور اس کی محبت میں اپنے وطنِ مالوف کو خیرباد کہتا ہے یہی صورت ہجرت میں بھی ہوتی ہے کہ انسان ظلم و عدوان سے انتہائی تنگ آ کر اپنے دین کو بچانے کے لیے اپنے گھر کو بے گھر بناتا ہے اور پھر خدا کی ساری زمین کو اپنا گھر تصور کرتے ہوئے ہر قسم کی دشواریوں کو سہتا ہے پس حج اور ہجرت کی مناسبت بھی ظاہر ہے۔

جیسے مال کا خاصۂ لازمہ یہ ہے کہ اس کی زیادتی سے قوت و قدرت میں زیادتی اور وسائل اختیار میں وسعت پیدا ہو جایا کرتی ہے چنانچہ مال دار انسان کے کاروبار کے لیے بیسیوں کارندے وصولیابی کا کام کرتے ہیں اور متعدد نوکر چاکر گھر بار کے کام نپٹاتے ہیں۔ غرض مال کی آمد سے لوازماتِ امارت خود بخود پیدا ہوتے چلے جاتے ہیں۔

اسی طرح سے مسلمانوں کی اجتماعی زندگی کو سنوارنے کے لیے اور ان میں وسائل

قوت و قدرت پیدا کرنے کے لیے نظامِ خلافت قائم کیا جاتا ہے اور ایک امیر منتخب کر کے خدا اور رسول کی اطاعت کے بعد تیسری اطاعت کا اسے حقدار تصور کیا جاتا ہے۔ پس بحکم امیر اسلام عمالِ خلافت کا خدا کے نام پہ آسمانی حکومت قائم کرنے کے لیے زکوٰۃ و صدقات عشر و خراج وصول کرنا بیت المال کے ذریعہ سے غریبوں کی دستگیری کرنا اجتماعی زندگی کو سنوارنا اور اس کو پُرشوکت بنانا یہی وہ خلافت و زکوٰۃ کی باہمی مناسبت ہے جس کی طرف ہم نے ابتدا میں اشارہ کیا تھا۔

معلوم ہوا کہ اسلام کے یہ دس زریں اصول ہیں جن میں پانچ بنیادی حیثیت لیے ہوئے ہیں اور پانچ امور تکمیل مقصد کے لیے اساسی حیثیت رکھتے ہیں۔ چنانچہ جہاں ان پانچ امور پہ عمل کرنا ضروری ہے۔ ان کو بقول حضرت شاہ اسماعیل شہیدؒ قوت و قدرت پیدا کرنے کے لیے عمل میں لانا بھی لازمی ہے۔ چنانچہ نماز باجماعت مطلوب خدا و رسولؐ ہے اسی طرح سے زکوٰۃ بالامیر در خلافت بالجماعت بھی مطلوب خدا و رسول ہے۔ اس دین کا سب سے بڑا کمال ہر سلسلہ میں آسانی کی راہ دکھلانا ہے اس نے کسی کو کبھی کوئی ایسی تکلیف نہیں دی جو اس کی قدرت و استطاعت سے باہر ہو۔ ہر حالت میں اسلام کے لیے ایک نقشہ اطاعت و فلاح پیش کرتا ہے۔ گری سے گری حالت میں اسلام کی دستگیری سے اس کا حلقہ بگوش محروم نہیں ہوتا۔ کسی اسٹیج پہ بھی وہ اپنے متبعین کو مایوس نہیں کرتا۔

چنانچہ اسلام کے مذکورہ بالا پانچ بنیادی ارکان میں بھی یہی سہولت نمایاں

ارکانِ خمسہ نفسِ فرضیت میں ایک دوسرے سے مساوات رکھتے ہیں۔ لیکن
شرائطِ فرضیت مختلف الدرجات ہیں اور یہ اختلافِ درجات بھی آسانی
پیدا کرنے کے لیے ہے۔ چنانچہ پانچ فرائض میں سے دو فرض یعنی اقرار
توحید و رسالت اور حج بیت اللہ تو ایسے فرض ہیں جن کی ادائیگی ساری عمر
میں بشرطِ قدرت و استطاعت ایک ہی بار فرض ہوتی ہے اگر ایک شخص ساری
عمر میں ایک مرتبہ بھی توحید و رسالت کا اقرار کر لے اور حج کو چلا جائے تو اگرچہ
اس کے بعد کسی قدر اس کو استطاعت و قدرت ہو مگر ان دونوں کی فرضیت
باقی نہیں رہتی۔ اقرارِ توحید و رسالت کے لیے قدرت و استطاعت کی قید
شریعت نے اس لیے لگائی ہے کہ گونگے شخص سے زبانی اقرار ممکن نہیں ہوتا نہ جو
شخص اعدائے اسلام میں گھر جائے اسی کے لیے اقرارِ توحید و رسالت آسان
ہوتا ہے۔

اب رہ جاتے ہیں بقیہ تین فرائض، سو ان میں سے دو فرض یعنی روزہ
زکوٰۃ سال بھر میں جا کر کہیں قابلِ ادائیگی ٹھہرتے ہیں اور وہ بھی جب کہ ان کی
ادائیگی کی شرطیں پائی جاتی ہیں۔ روزہ مریض، مسافر، شیخ فانی پہ عائد نہیں رہتا
ایسے ہی جو مسلمان صاحب نصاب نہ ہو یا صاحبِ نصاب تو ہو مگر مقروض ہو تو ایسے
لوگوں پہ زکوٰۃ عائد نہیں ہوتی اسی طرح سے حج کے لیے اگر مال و طریق اطمینان
صورت نہ رکھیں تو یہ فریضہ بھی مسلمان کے سر نہیں رہتا۔ البتہ صرف نماز ایک ایسا
دائمی فریضہ ہے جو شاہ و گدا، عالم و جاہل، مرد و عورت، اندھے، کالے، لولے
لنگڑے، بیمار و تندرست سب پر عمر بھر عائد رہتا ہے اور سوائے بے عقل

وبیہوشی وحالت حیض ونفاس کے کوئی حالت ایسی نہیں ہوتی کہ جس میں نماز فرض نہ ہو۔

بنی ثقیف نے جب اسلام قبول کیا تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ان کے ایک وفد نے حاضر ہو کر یہ درخواست کی کہ نماز ہمارے لیے معاف کر دی جائے۔ حضورؐ نے جواباً ارشاد فرمایا جو دین بلا نماز کے ہو اس میں کوئی خوبی نہیں ہے۔

پھر مزید سہولت یہ دی گئی۔ ہے کہ پانچ وقت کی نمازوں کے لیے پانچ وقت الگ الگ مقرر کیے ہیں۔ گویا دن رات میں سترہ رکعتوں کو پانچ وقتوں پر تقسیم کر دیا گیا ہے جو تکلیف اکٹھی نمازوں میں ہوتی اس سے بھی بچا دیا گیا ہے چوبیس گھنٹوں میں سے اگر فی رکعت ایک منٹ کا بھی اوسط رکھا جائے تو صرف سترہ منٹ بیٹھتے ہیں۔ تیئس گھنٹے ۴۳ منٹ دنیا کے کاموں کے لیے دیے گئے ہیں اور دین کے لیے صرف سترہ منٹ ہر روز مطلوب ہیں جو ظاہر ہے کہ کچھ بھی نہیں۔ جسمانی عالم جو ایک دن فنا ہونے والا ہے جس میں ہمارا جسم سو پچاس برس سے زیادہ نہیں رہتا اس کے لیے چوبیس گھنٹوں میں سے تیئس گھنٹے ۴۳ منٹ دنیا پر کس قدر احسان عظیم ہے۔ حالانکہ ہونا چاہیے تھا برعکس روح کے لیے جو ابدی ہے اور غیر فانی ہے اس کو حیاتِ ابدی سے ہمکنار ہونے کے لیے ۲۳ گھنٹے ۴۳ منٹ دیئے جاتے اور جسم کو صرف سترہ منٹ اپنے کاموں کے لیے ملتے۔ مگر یہ کس قدر شکر کا مقام ہے کہ ہمیں صرف سترہ منٹ میں حیاتِ ابدی حاصل کرنے کا موقع دے دیا گیا ہے۔

عقائدِ اسلام

یہ تو فرائض خمسہ کی سہولت کا حال تھا اور جو واجبات خمسہ تکمیل دین کا ذریعہ ہیں ان کی سہولت بھی ملاحظہ ہو۔

جہاد بچوں پہ فرض نہیں ہوتا اور ہر حالت میں اس کی فرضیت بھی قائم نہیں رہتی۔ ہجرت کے لیے کسی وقت کی بھی قید نہیں وہ انتہائی اور ناگزیر حالات سے تابع رکھی گئی ہے جب کہ عرصۂ حیات تنگ ہونے لگے۔ رہ گیا نظامِ خلافت کا قیام سو اگر وہ قائم ہو تو عمر بھر بجز اطاعتِ خلیفہ کے کوئی تکلیف اس سلسلہ میں نہیں ہوتی۔ اور اگر نظامِ خلافت قائم نہ ہو تو یہ فریضہ کل مسلمانانِ عالم کا ہوتا ہے۔ سو غور کرو کہ ہمارے حصہ میں اس تکلیف کا کونسا حصہ آتا ہے۔ رہ گیا ایثار و خلوص سو اگر کچھ دنوں بزرگوں کی صحبت اختیار کر لی جائے اور عمل میں اس کی حفاظت ہو تو ساری عمر کے لیے پھر یہ نعمت نصیب ہو جاتی ہے۔ اس میں بھی انسان کو کوئی خاص محنت و مشقت نہیں اٹھانی پڑتی۔ ہاں دعوتِ قرآن البتہ ایک ایسا فریضہ ہے جو نماز کی طرح سے عمر بھر واجب رہتا ہے سو اس کے لیے اگر ہفتہ میں جمعہ کا ایک دن بھی مخصوص کر لیا جائے جس میں ہم آمرون بالمعروف والناھون عن المنکر بن جایا کریں اور اپنے شہر اور مضافات شہر کے لوگوں کو قرآن کریم سنایا کریں اور خدا کی طرف سے غافل بندوں کو پھر اس کے ساتھ جوڑنے کی سعی کریں تو یہ بھی مشکل نہیں رہ سکتی اور امر بالمعروف نہی عن المنکر کی عادت تو ہمیں دن رات دائمی طور سے ہونی ہی چاہیئے جس کا سب سے پہلا مستحق خود ہمارا گھر ہے پھر محلہ شہر پھر اپنا ملک اور اس سے آگے جس قدر جس کو قدرت و توفیق میسر آئے سو عمل کے سلسلہ

میں دائمی طور پر نماز اور دعوت و تعلیم قرآن کی تکلیف بھی کوئی ایسی تکلیف نہیں ہے جس کو ہم برداشت نہ کر سکیں بلکہ سچ پوچھیے تو ہم اپنے کاروبار کے ساتھ بآسانی ان کو جمع کر سکتے ہیں اور واقعتہً یہ دین کی ترقی کے ساتھ ساتھ دنیوی ترقیات کا بھی موجب ہیں۔ ہاں یہ شرط ضرور ہے کہ دین سے دنیا کمانے کی خصلت چھوڑ دی جائے دین سے دنیا کمانا بدترین خصلت ہے اور دنیا کو دین کے لیے حاصل کرنا بہترین عادت ہے۔

بہرحال دعوتِ دین و دعوتِ قرآن واجب ہے انفرادی حیثیت سے بھی اور اجتماعی حیثیت سے بھی۔ دعوت دین کا تارک واجب کا تارک ہے۔

دعوتِ دین کے تین طریقے ہیں :۔

بالید، باللسان ، بالقلب۔

باللسان دعوت کا متوسط درجہ ہے۔ بالقلب دعوت کا ادنیٰ مرتبہ ہے۔ اور بالید اعلیٰ مرتبہ ہے۔ دعوتِ دین کے لیے چند ماہر تبلیغ علمائے ربانی سے رجوع شرط ہے تاکہ دعوتِ دین کے صحیح طریقے معلوم ہو سکیں اور غلط طریقوں سے دعوت حق کو نقصان نہ پہنچے آغاز دعوت ہمیشہ ابتداً گھر سے شروع ہونا چاہیے۔ پھر شہر کے خواص سے اور پھر اپنی قوم سے کسی قوم کے خواص کا سدھر جانا ساری قوم کا سدھر جانا ہے اور ان کا بگڑ جانا ساری قوم کے بگڑ جانے کے مترادف ہے۔

طہارت اور ارکان اسلام

لباس و بدن اور جائے نماز کی پاکی نماز کی شرط اولین ہے جو واجب ہے۔ طہارت کی بھی نجاست کی طرح دو قسمیں ہیں۔ طہارت صغریٰ، طہارت کبریٰ۔ طہارتِ صغریٰ وضو ہے۔ طہارت کبریٰ غسل ہے۔ نجاستِ صغریٰ حدث ہے (یعنی اخراج ریح کی وجہ سے بے وضو ہو جانا)، نجاستِ کبریٰ جماع وغیرہ سے منی کا اخراج ہے جس کی وجہ سے غسل واجب ہوتا ہے ایک تقسیم نجاست کی اس طرح بھی کی گئی ہے :۔

(۱) نجاستِ حقیقی جیسے پیشاب پاخانہ اخراج منی وغیرہ۔

(۲) نجاست حکمی جیسے انسان کا بے وضو ہونا، عورت کا حیض و نفاس کی حالت میں ہونا وغیرہ۔

غسل و وضو مرض و معذوری کی حالت میں ساقط ہو جاتے ہیں مگر بدل کے ساتھ جس کا نام تیمم ہے، غسل و وضو کا اہتمام صحت جسمانی کے لیے بھی بے حد مفید ہے۔ حدیث میں ہے۔

الطہور شطر الایمان پاکی نصفِ ایمان ہے۔

جس طرح نماز کے لیے بدن کی پاکی شرط ہے اسی طرح سے دعوتِ قرآن کے لیے دل کی پاکی اور مخلوق سے عدم سوال شرط ہے جس طرح بدن کی نجاست قابلِ نفرت سمجھی جاتی ہے۔ اسی طرح سے قلب کی نجاست یعنی کفر و شرک حسد و بغض اور کینہ قابلِ نفرت۔



حفاظتِ جمعہ و مساجد

جس طرح سے ہم اپنے جسم کی حفاظت کے لیے مکان بنانا اپنے لیے ضروری سمجھتے ہیں اسی طرح سے اپنی روحانیت کی حفاظت و بقاء کے لیے تعمیر و حفاظت مسجد مسلمانوں پر لازم ہے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم جب مکہ سے ہجرت فرما کر مدینہ کے قریب قبا میں پہنچے تو حضور نے سب سے پہلا کام یہی فرمایا کہ قبا میں مسجد کی بنیاد ڈالی جو آج تک مسجد قباء کے نام سے قائم چلی آرہی ہے مسجد خدا کے ذکر کی وجہ سے انتہائی مقدس و محترم جگہ ہے۔ مساجد کی حفاظت اور ان کا انتظام مسلمانوں پر لازم ہے ہماری مسجدوں کی ویرانی خواہ وہ ہمارے عمل سے ہو یا اغیار کے عمل سے ہو۔ بہر وصورت ہمارے لیے سخت آزمائش کا سبب ہے اور اپنی کوتاہیوں کی صورت میں موجب وبال ہے۔

مسجد عام اوقاف کی طرح پر نہیں ہے۔ مسجد محض بانیٔ مسجد کی زبان سے اتنا کہہ دینے پر کہ میں اپنے فلاں مکان یا فلاں جگہ کو مسجد قرار دیتا ہوں عند اللہ و عند الناس ہمیشہ کے لیے وقف ہو جاتی ہے جس کی حفاظت اہلِ اسلام پر لازم ہو جاتی ہے ہر جگہ کے مسلمانوں پر لازم ہے کہ وہ اپنے شہر کی جملہ مسجدوں کی ایک فہرست بنا کر ایک مضبوط کمیٹی بنائیں جب تک ہم اللہ کے گھر کے محافظ نہیں بنیں گے اس وقت تک ہمیں اس کا حق نہیں پہنچتا کہ ہم اللہ سے اپنے گھروں کی حفاظت کی توقع باندھیں۔ کثرت مساجد مطلوب

نہیں بلکہ مساجد کا نمازیوں سے بھرپور رہنا مطلوب حق ہے جس مسجد کی آمدنی اس کے اخراجات سے زائد ہو ایسی مسجد کے منتظمین پر ضروری ہے کہ وہ مسجد کے زائد سرمایہ کو تعلیم دین میں لگائیں مسلمان بچوں کو صنعت و حرفت سکھلائیں قرآن کریم کو مادری زبان میں سمجھانے کے لیے مسجدیں کسی مستند عالم سے ترجمہ قرآن شروع کرائیں۔ شکستہ مساجد کی مرمت کرائیں۔ خطبات جمعہ جو عربی میں دیے جاتے ہیں جن سے کل ممالک میں عربی زبان کی وحدت و اہمیت قائم ہے۔ ان خطبات کو عربی میں از سرِ نو باترجمہ تیار کرا کر قبل از خطبہ یا بعد پڑھے لکھے نمازیوں کو تقسیم کیا کریں اور امام سے قبل از خطبہ یا بعد از خطبہ مادری زبان میں بھی زبانی نصیحت و موعظت کا سامان کرائیں۔

حضرات شیخین رضی اللہ عنہما خطبہ جمعہ کا بہت اہتمام فرماتے تھے جملہ ضروریات و احوال قومی کو قوم کے آگے رکھا کرتے تھے ہم کو بھی انہیں کی سنت پر عمل پیرا ہوتے ہوئے ایسا کرنا چاہیئے ایک ہی خطبہ کو ہمیشہ پڑھتے رہنا جو وہ ہے جو اکثر اہلِ علم کے عربی نہ بول سکنے کی وجہ سے اب ایک سنت کی صورت اختیار کر گیا ہے۔ جب خطبۂ جمعہ واجب ہے تو اس کی تفہیم کس لیے غیر ضروری قرار پا سکتی ہے۔

شعائرِ اسلامیہ :

۲۶
چھبیسواں عقیدہ یہ ہے کہ مسلمان اپنے دینی و مذہبی شعائر کی حفاظت و حرمت کو اپنے اوپر واجب و لازم سمجھیں۔

شعائر جمع ہے شعیرہ کی جس کے معنی علامت و نشان کے ہیں، اسی سے شعار ہے۔ مسلمانوں کے وہ مذہبی نشانات و علامات ہیں جو مذہبی حیثیت سے ان کے ساتھ خاص ہوں یعنی جن سے ان کی دینی آبرو اور مذہبی خصوصیات نمایاں ہوں ان کو ترک کرنے سے فسق کے آثار رونما ہوتے ہیں اور ان کے پکڑنے سے تقویٰ قلبی میسر آتا ہے۔

اشعار کی دو قسمیں ہیں۔ شعائر اللہ۔ شعائر الاسلام۔ شعائر اللہ وہ شعار ہیں جو اسلام سے پہلے بھی اہل حق کا شعار تھے اور جن کی نسبت براہ راست اللہ سے ہے۔ شعائر اسلامیہ وہ ہیں جو ظہور اسلام کے بعد قوم مسلم کا نشان مذہبی قرار پائے۔ ان دونوں میں عموم خصوص کی نسبت ہے۔ مشہور و معروف شعائر یہ ہیں :۔

بیت اللہ۔ رسول اللہ۔ کتاب اللہ۔ صلوٰۃ۔ جہاد۔ ہجرت۔ خلافت۔ مساجد۔ اذان۔ جمعہ۔ جماعت۔ مقامات مقدسہ۔ مقابر انبیاء۔ پرچم اسلامی احرام۔ طواف۔ حلق۔ رمی۔ قربانی۔ تکبیرات تشریق۔ سعی صفا مروہ۔ وقوف عرفات و مزدلفہ۔ ختنہ۔ دوگانہ عیدین۔ زیارت حرمین۔ دعوت قرآن و تبلیغ حق۔ اشاعت اسلام بذریعہ سیاحت عالم۔ تجہیز و تکفین۔ بطریقہ اسلام۔

نوٹ :۔ دیگر مذاہب کے مذہبی مراسم و شعائر کی حفاظت بھی مسلمانوں پر لازم ہے تاکہ دوسری قومیں بھی ان کے شعائر کی حفاظت اور عزت کرنے پر مجبور ہوں۔

دستگیری خلائق۔ اعانتِ مظلوم۔ وفائے عہد۔ مٹھی بھر داڑھی کا رکھنا۔ مونچھوں کا کتروانا وغیرہ۔

حقوق و معاملات :

ستائیسواں عقیدہ یہ ہے کہ انسان اپنے لین دین وغیرہ کے جملہ معاملات کو اسلام کے اصول اور اس کے احکام کے سانچہ میں ڈھال کر خداوند عالم نے جو حقوق ذوالفضل اس پر عائد فرمائے ہیں۔ ان کو بحیثیت مسلمان ہونے کے ادا کرنے کا خاص اہتمام کرے۔ پابندی معاہدہ۔ وفائے عہد۔ دیانت۔ راست گوئی۔ کتابت معاہدہ۔ صفائی معاملہ۔ خوش خلقی کو روح معاملہ بنا کر دونوں جہاں کی سرخروئی حاصل کرے جس شخص کا معاملہ صحیح نہیں ہوتا۔ اس کی عبادت بھی قبولیت کا مرتبہ نہیں پاتی جیسے ہر درخت اپنے پھل سے پہچانا جاتا ہے اسی طرح سے انسان بھی اپنے معاملہ ہی سے پہچانا جاتا ہے۔

یہ سات اصول معاملہ کی کسوٹی ہیں جن سے کھرا کھوٹا پرکھ لیا جاتا ہے۔ انسان کو بدو شعور سے لے کر تا دم مرگ اصولاً دو قسم کے تعلقات معاملات و حقوق سے واسطہ پڑتا ہے ایک اپنے خالق سے دوسرے اس کی مخلوق سے اس لیے اصولاً حقوق کی بھی دو ہی قسمیں سمجھنی چاہئیں۔

(۱) حقوق اللہ (۲) حقوق الخلق۔

حقوق اللہ کے تحت میں حقوق الاسلام۔ اور حقوق الوحی والالہام دونوں شامل ہیں۔ حقوق الخلق کے تحت میں حسب ذیل حقوق آتے ہیں جو یہ ہیں :۔

حقوق الملائکہ۔ حقوق الاجنہ۔ حقوق الانبیاء۔ حقوق النفس۔ حقوق المسلم۔ حقوق الاخوان۔ حقوق الانسان۔ حقوق الخلفاء والعلماء۔ حقوق اہل البیت۔ حقوق الوالدین۔ حقوق الزوجین۔ حقوق الاولاد۔ حقوق العشیرہ۔ حقوق المحرومین والمعذورین۔ حقوق الحیوان۔ حقوق السفر والحضر۔ حقوق الملک۔ حقوق الوطن۔ حقوق الحرمین الشریفین۔

یہ اکیس حقوق ہیں جو زندگی بھر مسلمانوں پر مختلف اوقات و حالات میں عائد ہوتے ہیں اور جن کو پورا کرنے کے لیے مسلمان کا اسلام درجہ کمال حاصل کیا کرتا ہے۔ مناسب ہے کہ ایک ایک دو دو جملوں میں ہر ایک حق پر مختصر سی روشنی بھی ڈال دی جائے تاکہ مکمل طور سے حقوق کا خلاصہ ذہن نشین ہو جائے۔

۱۔ حقوق اللہ کا خلاصہ یہ ہے کہ انسان اللہ کو مخلوق سے بلند و برتر مانے اور اسی کو وحدہٗ لاشریک اور نفع و ضرر کا مالک جان کر ہر سلسلہ میں اپنی توقعات کا مرجع و مرکز ٹھہرائے۔

۲۔ حقوق الخلق کا لُبِ لباب یہ ہے کہ انسان کل مخلوق کو خالق کا محتاج تصور کر کے اپنی جملہ ضرورتوں اور حاجتوں میں مخلوق سے کام لے مگر مخلوق کو نفع و ضرر کا مالک کبھی نہ سمجھے۔ نیز جو مخلوق جس غرض کے لیے پیدا کی گئی ہے اس مخلوق سے اسی قسم کا کام لیا جائے اس کے خلاف کبھی نہ کیا جائے۔

۳۔ اسلام کا حق اوّلین یہ ہے کہ انسان اس کے حق کو جملہ حقوق پر مقدم کرے زندگی بھر اسے اپنے فکر و عمل کا راہنما بنائے اس میں اپنی طرف سے کمی بیشی

بھی نہ کرے اور اس کا حکم دنیا میں بلند کرنے کے لیے ہر قسم کی قربانیاں عمل میں لائے اپنے کسی قول و فعل سے دوسروں کی نظر میں کبھی اس کو غیر وقیع نہ ہونے دے۔

۴۔ حق وحی والہام یہ ہے کہ انسان اپنی عقل کا دائمی راہنما بن جائے۔ قرآن کریم اس کا عطر و خلاصہ سمجھ کر مدار نجات ٹھہرائے جسے بغیر طہارت کے کبھی نہ چھوئے۔

۵۔ حقوقِ ملائکہ یہ ہیں کہ انسان ان کو اپنی روح کا ان دیکھا محافظ سمجھ کر ان کا ادب و احترام ہمیشہ ملحوظ رکھے نہ زبان سے کبھی گالی وغیرہ نکالے جس کو سن کر انہیں اذیت ہوتی ہے اور نہ اپنے کسی فعل ہی سے ان کو اذیت پہنچائے نہ کوئی برا جانور مثل کتا۔ سور ہی اپنے گھر پالے کہ جس کی وجہ سے انہیں تکلیف ہوتی ہے نہ انسانیت و ملکیت سوز عریان تصویریں ہی اپنے گھر میں لگائے کہ جن کو دیکھ کر وہ انتہائی دکھ اٹھاتے ہیں۔

۶۔ جنوں کا حق یہ ہے کہ ان کو مخصوص اعمال کے ذریعہ سے اپنا تابع بنا کر پریشان و مقید نہ کیا جاوے اور ایسی غذاؤں سے اور اقوال و اعمال سے بھی بچتا رہے جو ناریت کو بڑھا کر شیطان کی دسترس بڑھانے والی ہوں۔ نیک جنوں کے لیے توبہ و استغفار کرے اور قرآن شریف کی تلاوت سے ان کی ناریت کو سکون بخشے۔

۷۔ حقِ انبیاء یہ ہے کہ ان کو خلاصہ سعادت اور محسن عالم سمجھ کر جب بھی ان کا نام لے تو ان پر سلامتی بھیجے اور ان سب کے سردار امام خاتم الانبیاء صلی اللہ

علیہ وسلم پر ہمیشہ درود و سلام بھیجے جنہوں نے شدید مصائب جھیل کر کل انبیاء کی تعلیمات کا صحیح نقشہ ہم تک پہنچایا۔ اسی ضمن میں حضرات صحابہ و اہل بیت اور استاد و شیخ کے حقوق بھی نہ بھولے کہ انہوں نے بھی اسی نقش قدم پر چل کر ہم تک اسلام پہنچایا اور اس نعمت سے ہمیں نوازا۔

۸۔ حق نفس یہ ہے کہ اس کی جائز خواہشات کو پورا کرے۔ ناجائز خواہشات کے وقت بڑی دانائی سے ان کا رخ پھیر دے اور اس کو تیز رو گھوڑے کی طرح سے کودنے اچھلنے والی سواری سمجھ کر صبر اور ضبط کا اسے لگام دے کر اپنے قبضہ سے کبھی باہر نہ ہونے دے ہمیشہ اس کو اپنا تابع رکھے خود کبھی اس کا تابع نہ بنے۔ کچھ عرصہ کے لیے نفس کشی بھی کرے۔ مگر مدت العمر نہیں ورنہ تو مادی ترقیات کا سلسلہ ہی ختم ہو جائے گا۔

۹۔ حق مسلم یہ ہے کہ جب کوئی مسلمان بھائی ملے تو اس کو سلام کرے۔ ایک دوسرے کی جان و مال آبرو کو ایک دوسرا اپنے اوپر حرام سمجھے یعنی نہ کوئی کسی کی کبھی بے عزتی کرے نہ کوئی کسی کا ناحق خون بہائے نہ بغیر اجازت کوئی کسی کا مال کھائے۔ مظلوم و مصیبت زدوں کی حمایت و امداد کی جائے اپنے قول سے یا عمل سے کوئی کسی کو نہ جانی تکلیف دے اور نہ مالی بلکہ ہمیشہ شیریں زبانی اور خوش خلقی سے کام لے۔ جب کسی واقعہ کے اظہار کا موقعہ آئے تو کتمانِ شہادت کا گناہ بھی نہ کیا جائے جو حق بات ہو اس کو ظاہر کر دیا جائے اگرچہ وہ اپنے کسی عزیز قریب کے خلاف ہی کیوں نہ ہو آپس میں ایک دوسرے پر ترس کھائیں اور موم کی طرح سے نرم رہیں۔ خدا کے دشمنوں کے مقابلہ میں

لوہے کی طرح سب سخت نظر آئیں۔ یعنی دین میں ایمان کو اساس ٹھہرائیں سود سے بچیں۔ جوئے کو اجتماعی زندگی کے لیے تباہ کن تصور کریں۔

۱۰۔ بھائی بندی تین قسم کی ہوتی ہے :-

ایک بوجہ نسبی قرابت۔ دوسرے بوجہ انسانیت۔ تیسرے بوجہ دین۔ پس ایمان و اسلام کی وجہ سے جو اخوت قائم ہو۔ اس کا حق یہ ہے کہ آپس میں اتفاق و اتحاد کو قائم رکھیں جو آپس میں ناچاقی ہو جائے تو صلح کرا دیں انسانیت دوستی کی وجہ سے جو اخوت قائم ہو اس میں مدار محبت اللہ کی ذات کو بنایا جائے۔ اسی لیے جو اپنے لیے چاہے وہی اپنے دوست کے لیے بھی چاہے اسے نیک راستہ پر چلائے اس پر کوئی مصیبت آپڑے تو آنکھ نہ چرائے بلکہ جس قدر مدد کرنے کی قدرت ہو اس سے دریغ نہ کرے جن سے بوجہ قرابتِ نسبی کے اخوت قائم ہو اور ان کے دکھ سکھ کا شریک رہے ان کے دشمنوں کو اپنا دشمن اور ان کے دوستوں کو اپنا دوست جانے۔ صلہ رحمی کرے۔ کسی سے کوئی زیادتی ہو جائے تو درگذر کرکے برائی کا بدلہ بھلائی سے دے۔ غریب و نادار بھائی ہوں تو بقدر گنجائش مال سے بھی ان کی خبر گیری کرے۔

۱۱۔ حقوق انسانی یہ ہیں۔ ایک دوسرا ایک دوسرے کو محض مال کی کمی زیادتی کی وجہ سے بہ نظر حقارت نہ دیکھے بلکہ طغرائے امتیاز اخلاق و شرافت و پرہیزگاری حزم و احتیاط کو سمجھیں کوئی کسی کو جانی یا مالی تکلیف نہ دے۔ مظلوم و مصیبت زدہ کی مدد کرے خواہ وہ کسی مذہب سے تعلق رکھنے

والا ہو۔ لین دین میں اپنے پرائے کا کوئی فرق نہ کریں بلکہ ایمان وانصاف اور مساوات وخوش خلقی پہ اس کی بنیاد رکھیں۔

١٢۔ علمائے حق کو وارثین انبیاء سمجھتے ہوئے ان کی توقیر کرے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلفاء اور عادل حکام کو تعظیم دیتے ہوئے جب تک وہ خلاف شریعت کوئی حکم نہ دیں۔ ان کے حکم سے سرتابی نہ کی جائے اگرچہ امیر اسلام اپنے ذاتی اعمال کے لحاظ سے فاسق ہی کیوں نہ ہو۔ ہاں جب کسی معصیت کا حکم دے تو اطاعت نہ کی جائے۔ علمائے حق کی توقیر نبوت کی توقیر کے مترادف ہے اور علمائے سُوء سے اجتناب شیطنت کے اجتناب کے ہم معنی ہے دونوں قسموں کے سمجھنے میں غلطی نہ کی جائے۔

١٣۔ حق البیت یہ ہے کہ ایک گھر کے سب افراد مل کر گھر کے بڑے کی تعظیم کریں۔ اس کے احکام سے سرتابی نہ کریں بڑا چھوٹوں کے حقوق کی نگہداشت کرے اور یہ سب چھوٹے بڑے اپنے کو خدا کے آگے جوابدہ سمجھیں مقررہ حدود سے کوئی تجاوز نہ کرے۔ گھر کے بڑے کا اہم فرض یہ ہے کہ وہ اپنے چھوٹوں کی آئندہ زندگی کو سنوارے جس میں تین چیزیں بنیادی حیثیت رکھتی ہیں:۔

١۔ دین

٢۔ ازدواجی زندگی

٣۔ قابلِ اطمینان ذریعہ معاش

عورتوں کی تعلیم پر زیادہ زور دینا چاہیئے۔ تاکہ وہ بھی مردوں کی طرح تبلیغ کے قابل بن سکیں لیکن احکامِ الٰہیہ کا مضبوطی سے پاس رکھیں۔

١٤۔ ماں باپ کا حق بہت بڑا ہے وہی ہمارے لیے ذریعہ وجود بنتے ہیں ان کے احکام کو تحت شریعت بجالانا۔ کسی قول سے یا فعل سے ان کو ایذا نہ دینا اپنا مال ان کی مِلک تصور کرتے ہوئے بوقت حاجت اس مال سے ان کی خبر گیری کرنا۔ اگر وہ ظلم بھی کریں تو ان کو جواب نہ دینا یہ ان کے حقوق کا اجمالی خلاصہ ہے اگرچہ وہ مسلم بھی نہ ہوں۔

١٥۔ حق زوج یہ ہے کہ حقوق انسانیت میں اسے برابر کا شریک سمجھے۔ اس سے کوئی مشقت ایسی نہ لے جو اس کے فرائض سے خارج ہو۔ رحم دلی نرم خوئی سے پیش آئے۔ بیوی اپنے شوہر کو حاکم مہربان سمجھے اور شوہر اپنی بیوی کو اپنا رفیقِ حیات تصور کرتے ہوئے اگر اس سے کوئی غلطی ہو تو درگزر کرے بات بات پہ سختی نہ کرے۔ ہاں کوئی بے حیائی دیکھے تو اس پہ ضرور ٹوکے۔ میاں بیوی ایک دوسرے کی دین کو مضبوط بنائیں۔ عصمت وحجاب اور عدل ومساوات کو اپنے گھر کا مابہ الامتیاز بنائیں۔

١٦۔ اولاد کا حق یہ ہے کہ انہیں ابتداءً ضروریات دین واحکام ضروریہ سے واقف بنایا جائے۔ ابتدا ہی سے نیک صحبتوں کا انہیں عادی بنایا جائے پھر انہیں زراعت وتجارت۔ صنعت وحرفت۔ اجرت ومحنت کے کسی سلسلہ میں لگا کر اپنے پیروں پہ کھڑا کیا جائے پھر ان کی ازدواجی زندگی کو صحیح لائنوں پر قائم کیا جائے۔ اس سلسلہ میں کفو کا خاص خیال کیا جائے۔ مثلاً لڑکا تاجر گھرانہ کا ہے تو لڑکی بھی اسی ماحول سے ہونی چاہیئے۔ مناسبت نہ ہونے سے نسل میں عظیم نقصان واقع ہوتا ہے۔ عزت ومال اور علم وعقل کے لحاظ سے

سے بھی مناسبت یعنی ہم کفو ہونا چاہیئے جو ماں باپ بے غوری کے ساتھ ازدواجی زندگی قائم کر دیتے ہیں۔ وہ خدا کے یہاں مواخذہ دار ہوں گے۔

۱۷۔ کنبہ۔ برادری کا بھی بہت بڑا حق ہے جو چیز برادری مل کر طے کر دے اس کے خلاف نہ کیا جائے۔ بشرطیکہ وہ خلاف شریعت نہ ہو۔ اجتماعی زندگی کا ابتدائی پیمانہ برادری کی یکجہتی ہی ہے جس کو اجتماعی حیثیت سے باعزت وباثر بنانا برادری کے ہر ایک فرد کا فریضہ ہے۔ برادری میں نا اتفاقی کبھی نہ ہونے دی جائے۔ فرق مراتب درجات کو کبھی ہاتھ سے نہ جانے دیا جائے حلم ووضع داری ادب واحترام کو مجلسی زندگی کی روح بنایا جائے۔ غربا پروری محتاج نوازی کو برادری کا طغرائے امتیاز قرار دیا جائے۔

۱۸۔ محروم الاسباب لوگوں کی خبر گیری بھی انفراداً واجتماعاً ضروری ہے یتیموں محتاجوں، مسکینوں، معذوروں کی دستگیری اور ان کو ان کے حسب حال امداد سے کبھی محروم نہ کیا جاوے۔ محروم الاسباب لوگوں میں سے جو پھر عجز سے قدرت کا مرتبہ حاصل کر سکتے ہوں ان کو اسی شرط پہ امداد دی جائے۔ یہ طریقہ امداد مہلک ہے کہ ان کو ہاتھ پیر توڑ کر مفت خوری کی عادت ڈلوا دی جائے اصل خدمت ان کی یہ ہے کہ ان کی اخلاقی ومادی حیثیت کو سنوارا جائے۔

۱۹۔ حق حیوانات یہ ہے کہ جو حلال جانور ہیں اور جن کے تحت شریعت وقانون ممانعت بھی نہیں ہے۔ ان کے جسموں کو ہم اپنے جسموں کی جان بنائیں جو جانور سواری وغیرہ کے کام آتے ہیں ان سے اس کے خلاف کوئی کام نہ لیں نہ ان پر ایسی کوئی مشقت ہی ڈالیں جو ان کی ہمت وقوت سے باہر ہو۔ موذی جانوروں کو وقت ضرر مارنا خلافِ انسانیت نہیں ہے۔ بغیر ایذا یا منفعت وضرورت کے کسی جانور کو بمحض مشغلہ تفریح ونشانہ بازی بنا کر مارنا شرعاً مذموم ہے کل مخلوق انسان کے لیے پیدا کی گئی ہے جس کے استعمالِ صحیح کا اسے حق دیا گیا ہے۔ پس کسی مخلوق کا غلط استعمال انسان کے لیے جائز نہیں۔ جانوروں کو بھوکا پیاسا رکھنا بہت بڑا گناہ ہے جس کا وبال ان کی بے زبانی کی وجہ سے نہیں پڑتا ہے۔

۲۰۔ حق سفر یہ ہے کہ انسان اپنی ضروریات پر زیادہ سے زیادہ قابو پا کر انہیں کم کرے جس قدر پونجی اس کے پاس ہو اسے رکھ کر دیکھ کر خرچ کرے ایک سے زیادہ آدمی ہمراہ ہوں تو ایک کو امیر سفر بنایا جائے جو مشترکہ ضروریات میں سب کا حکم ہو اور نظم سفر میں اعتدال ووحدت رونما ہو۔ سفر وسیلۂ ظفر ہے۔ سفر سے مختلف قسم کے تجربات انسان کو حاصل ہوتے ہیں۔ سفر سے یہ سبق بھی لینا چاہیئے۔ کہ ہماری زندگی بھی اسی طرح کا ایک سفر ہے۔ پس مسافر وہی اچھا ہے جو زمانہ سفر میں کسی پہ بار نہ ہو نہ کسی کو تکلیف پہنچائے اور بھلائی سے اپنا زمانہ گزارے مسافر وہی اچھا ہوا ہے جو ہم سفروں سے لڑے جھگڑے نہیں بلکہ اخلاق ومروت سے پیش آئے اپنے اوپر تکلیف اٹھائے مگر دوسروں کو تکلیف اٹھانے دے۔ سفر میں اسراف سے ہرگز کام نہیں لینا چاہیئے۔ اپنی پونجی سے ہر وقت ہوشیار رہنا چاہیئے۔ غیر متعلق لوگوں کی باتوں میں آکر اپنا سفر کھوٹا نہ کیا جائے۔ نہ کسی کو دھوکہ دیا جائے نہ کسی سے دھوکا کھایا جائے۔ زبان کو خاص طور پہ اپنے کنٹرول میں رکھے۔ حالتِ قیام کو حضر کہتے

ہیں اس میں بھی اس طرح زندگی گزارے کہ سب کے دل اس سے ہلکے رہیں

آں چناں زی کہ وقت مردن تو ہمہ گریاں شوند تو خنداں

۲۱۔ ملک حکومت سے بنتا ہے پس جس خطۂ زمین پر جس حکومت کے زیر اقتدار کوئی اپنی زندگی گزارے اس کو اپنی زندگی اس طرح سے گزارنی چاہیئے کہ اس کے وجود سے کوئی فتنہ فساد برپا نہ ہو۔ اسلام نے مغلوبیت کی زندگی گذارنا بھی مکی زندگی سے تبلایا ہے جس کی روح عدم تشدد اور صبر ہے اور اسلام نے مقتدر زندگی گذارنا بھی سکھلایا ہے جس کا آئینہ حضور کی مدنی زندگی ہے۔ پس مسلمانوں کو بھی حضور علیہ السلام کی انہی ہردو مقدس زندگیوں سے ملکی معاملات میں سبق لینا چاہیئے اپنے ملک سے محبت انسان کا ایک قدرتی حق ہے۔ اس لیے انسان کو اپنے ملک کا اور اپنے دین کا وفادار رہنا چاہیئے اپنے ملک میں مسلم حکومت ہو یا غیر مسلم نظر اس بات پر رکھنی چاہیئے کہ ہماری حکومت عادل ہے یا غیر عادل، عادل ہے تو اس کے لیے سینہ سپر رہے اور اس کی مدد کرے غیر عادل ہے تب بھی اس کی مدد کرے جس کی سب سے بڑی مدد اس کو ظلم سے روکنا ہے۔

۲۲۔ حق وطن یہ ہے کہ اپنے شہر میں اخلاقی جرائم کو پروان نہ چڑھنے دیا جائے نہ کسی بے وسیلہ پر ظلم کو برداشت کیا جائے۔ معاملات میں دیانت داری راست گفتاری کی ہمیشہ تلقین ہو۔ آپس میں میل ملاپ اور رواداری برتی جائے ناانفاقی ہو جائے تو اس کو ہرگز بڑھنے نہ دیا جائے۔ بیروزگاری کا انسداد سب اہل شہر مل کر ایک دوسرے کے لیے کریں۔ بیع وشریٰ نکاح وطلاق میں عدل وانصاف ومساوات کو ملحوظ رکھیں۔

۲۳۔ حرمین شریفین کو مسلمان اپنے وطنِ ایمانی سمجھے۔ ان کی زیارت مقصد زندگی ٹھہرائے اہل حرم کی تعظیم ودستگیری کو اپنے لیے ذریعہ نجات تصور کرے ان لوگوں سے زیادتی ہو تو دیار محبوب کے احترام کی وجہ سے اس کا کوئی خیال نہ کرے۔ حفاظت مساجد اللہ بھی اس کے ضمن میں آگئی جو ہر مسلمان پر واجب ہے۔

مسلمان جب تک ان اکیس[۲۱] حقوق کو پورا کرتے رہے دنیا میں سربلند رہے۔ اسلام ترقی پذیر رہا جب سے انہوں نے ان کو چھوڑا۔ تب ہی سے وہ دنیا کی نظروں میں ذلیل ہو گئے۔ بنی اسرائیل سے حق تعالیٰ آٹھ دس عہد لیے تھے کچھ اپنے لیے اور کچھ اپنی مخلوق کے لیے۔ چنانچہ جب تک وہ عہد پر قائم رہے حکومت ونبوت کے وارث رہے جب عہد سے پھرے تو رسوا ہوئے عہد کی تفصیل یہ ہے۔

۱۔ اللہ کے سوا کسی کو نہیں پوجیں گے۔

۲۔ والدین کے ساتھ انتہائی عمدہ سلوک کریں گے۔

۳۔ جسمانی وروحانی قرابت داروں کے ساتھ بھی اسی وضع کا سلوک کریں گے۔

۴۔ تیموں پر دست شفقت رکھیں گے۔

۴ ۔ خاک میں ملے ہوئے انسانوں کو ابھاریں گے ۔

۶ ۔ دوست یا دشمن ہم مذہب ہو یا غیر مذہب ہر ایک سے میٹھا بول بولیں گے

۷ ۔ نماز کو جماعت کے ساتھ دائمی طور پہ قائم رکھیں گے ۔

۸ ۔ اغنیاد بنی اسرائیل اسی طرح سے زکوٰۃ کو جماعت حق و امیر جماعت کے ذریعہ سے سدا قائم رکھیں گے ۔

۹ ۔ ناحق کسی کا خون نہ بہائیں گے ۔

۱۰ ۔ نہ کسی کو بے گھر بنا کر اجاڑیں گے ۔

مسلمانوں کو بھی ان دس عہدوں پہ ہمیشہ کاربند رہنا چاہیئے ۔

حجۃ الوداع کے موقعہ پہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کو جو آخری نصیحتیں فرمائیں ہیں وہ ہمیں ابتدا ہی سے یاد کرنی چاہئیں ۔

ازاں جملہ یہ بھی ارشاد فرمایا گیا تھا :۔

لوگو ! عمل میں خلوص ، مسلمان بھائیوں کی خیر خواہی اور جماعتی اتحاد ۔ یہ تین باتیں ایسی ہیں جو سینہ کو پاک رکھتی ہیں ۔ ہمیں چاہیئے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس زریں ارشاد کو ہم کبھی معاملات میں فراموش نہ کریں ۔ نکاح و طلاق بیع و شریٰ کی تفصیلات کو کتب فقہ سے حاصل کیا جائے ۔ یہاں ہم ان کی روح صرف ایک سطر میں پیش کرنا چاہتے ہیں ۔ حضور سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم ہر محتاج کو مدد دینے میں اور حق رسانی میں پیش پیش رہتے تھے اور حق طلبی میں سب سے پیچھے رہتے تھے ۔ ابتدائے نبوت میں حضورؐ کو مستقبل کی طرف سے فکر تھا ۔ اس وقت ام المومنین حضرت خدیجۃ الکبریٰؓ نے آپ کو

تسلی دیتے ہوئے فرمایا آپ ذرا غم نہ کریں ۔ اللہ تعالیٰ آپ کو کبھی آفتوں میں نہ ڈالے گا کیونکہ آپ صلہ رحمی کرتے ہیں حق کے کاموں میں لوگوں کی اعانت فرماتے ہیں اور کسب معاش فرماتے ہیں ، مہمانوں کی ضیافت کرتے ہیں ۔

بہترین معاملہ کی یہی چیزیں روح ہیں جن کو ہمیشہ مسلمانوں کو پیش نظر رکھنا چاہیئے ۔

حقوق اللہ و حقوق الخلق اور گناہِ کبیرہ

حقوق اللہ و حقوق الخلق کو گناہِ کبیرہ دیمک کی طرح سے چاٹ جاتے ہیں اس لیے ان سے بچنے کا خاص اہتمام ہونا چاہیئے ۔ ان گناہوں کی تھوڑی سی تفصیل یہ ہے :۔

فرائض کو ترک کرنا ۔ کسی کو ناحق قتل کر دینا ۔ شراب پینا ۔ سور کھانا ۔ رشوت و سود لینا دینا ۔ ماں باپ کی نافرمانی کرنا ۔ جھوٹ بولنا ۔ جھوٹی گواہی دینا ۔ جادو ٹوٹکے کرنا ۔ دین کے پیرائے میں دنیا کمانا ۔ لوگوں کو دھوکہ دینا یتیموں اور بیکسوں کا مال ہضم کر جانا ۔ حقوق شرعیہ کو جان بوجھ کر پامال کرنا ۔ ظلم کرنا ۔ خیانت کرنا ۔ غیبت کرنا ۔ بہتان تراشنا ۔ گناہِ کبیرہ توبہ سے معاف ہو جاتے ہیں ان پہ اصرار کفر ہے ۔ بغیر توبہ کیے مرجانے والے کو عذاب جہنم سے دوچار ہونا پڑے گا ۔

اِجتماعیات :

اٹھائیسواں[۲۸] عقیدہ اہل حق یہ ہے کہ انفرادی زندگی کو تازیست اپنے لیے لازم ٹھہرائیں اور حق وصداقت کو ہمیشہ اپنی اجتماعی زندگی کا نگہبان و نگران بناتے ہوئے لالچ و خود غرضی بخل و طمع جبن و نامردی بغض و عداوت کینہ و حسد وغیرہ سے دلوں کو پاک و صاف رکھیں ۔ جان و مال کو حق کی ملکیت سمجھتے ہوئے ان کو ہمیشہ حق پہ نثار کرنا سیکھیں ۔ نیز اپنی محبت اور دشمنی کا محور و مرکز بھی ہم ہمیشہ حق و انصاف ہی کو ٹھہرائیں ۔ یعنی اگر کسی سے ہمیں محبت ہو وہ بھی حق ہی کی خاطر ہونی ہی چاہیئے اور اگر اعدائے حق سے دشمنی ہو تو وہ بھی خدا ہی کے لیے ہو نفس کا لگاؤ کسی حال نہ ہونا چاہیئے ۔ اسی کے ساتھ ساتھ ہمیں کل ابنائے جنس کو ایک ماں باپ کی اولاد سمجھ کر سب کو اپنا بھائی سمجھنا چاہیئے اور حق اخوت کو ہمیشہ ملحوظ خاطر رکھنا چاہیئے ۔ سب سے بڑا حق اخوت یہ ہے کہ حق پرست بھائی دوسرے بھائیوں کو راہ حق دکھائے پھر ان میں جونسا بھائی بھی حق کو قبول کرے اس کو اپنا ایمانی بھائی سمجھے اس کے ہر ایک دکھ درد کو اپنا دکھ درد خیال کرے ۔ حدیث میں ہے ۔

المومنون کرجل واحد ان	تمام اہل ایمان ایک شخص واحد کی
اشتکی عینہ اشتکی کلہ	طرح ہیں ۔ جیسے آنکھ میں تکلیف
⁘ ⁘ ⁘ ⁘	ہونے کی وجہ سے سارا بدن تکلیف
⁘ ⁘ ⁘ ⁘	محسوس کرنے لگتا ہے ۔

یہی رشتۂ وحدت کل اہل ایمان میں بھی قائم کیا گیا ہے کیونکہ یہی ایمانی محبت وہ ناقابل انقطاع محبت ہے جو مرنے کے بعد بھی قائم رہتی ہے ۔ نفسانی محبتیں تو جسم کے فنا ہونے کے بعد ختم ہو جاتی ہیں ۔ لیکن ایمانی محبت بلاشبہ ایک سرمدی محبت ہے جو نہ صرف تازیست ہی قائم رہتی ہے بلکہ ابدالاباد تک اس کی رفاقت ہوتی ہے ۔

حیوانیت و اِنسانیت

یاد رکھو ! بندۂ نفس و ہوا ، بن جانا ۔ عیش پرستی و انانیت شعاری کا عادی ہو جانا ۔ خود مطلبی و خود غرضی کو اپنی زندگی کا محور و مرکز بنا لینا حیوانیت و شیطانیت ہے اور ایثار و خلوص کا عادی ہو جانا دوسروں کے لیے اپنے آپ کو تکلیف میں ڈالنا ذاتی مفاد کو ملی مفاد پہ مقدم کرنا انسانیت و ملکیت ہے کفر کا خاصا انفرادیت و انانیت ہے اور اسلام کا خاصہ اجتماعیت و انکساری ہے ۔ اسلام تکمیلِ اخلاق و تکمیل ایثار چاہتا ہے اسی لیے انسانیت کاملہ کو عملی دنیا میں بروئے کار لانے کا دوسرا نام اسلام ہے ۔ اسلام محض چند عقائد اور بدنی عبادتوں ہی کا نام نہیں ہے بلکہ اِسلام زندگی بھر کے ایک مکمل نظام کو کہتے ہیں جو ہر مرحلہ زندگی میں انسان کو راہِ ثواب دکھاتا ہے ۔ یہ مبارک اِسلامی نظام اسلامی نظام اسی وقت بروئے کار آسکتا ہے جب کہ فرزندان توحید میں اجتماعی آثار حیات پیدا ہوں اور فکر و عمل کا محور و مرکز حق و صداقت بنیں ۔

پس جو اجتماعی نظام خدائی احکام و قوانین کی راہنمائی سے کسی خطۂ زمین پر برسرِ اقتدار آ جائے اس کو نظامِ خلافت کہتے ہیں۔

مُلک اور دین

اسلام اپنی شکل و صورت میں اسی وقت نمودار ہو سکتا ہے۔ جب اس کی پشت پر ملک ہو۔ ملک اور دین دو جوڑواں بھائی ہیں جو آپس میں ایک دوسرے کے بغیر کچھ نہیں کر سکتے۔ اسلام کا مالی نظام اور اس کا ضابطہ دیوانی و فوجداری بغیر حکومت و اقتدار کے ہمیشہ معطل رہتا ہے۔

نصبِ خلیفہ بہت اہم فرض ہے

اسی لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد حضور کی تجہیز و تکفین سے بھی پہلے صحابہ کرام کے نزدیک سب سے زیادہ اہم ضروری فریضہ اگر کوئی تھا تو وہ نصب خلیفہ و قیام خلافت ہی تھا۔ چنانچہ اجلّہ صحابہ کا حضرت صدیق اکبر کو جانشین رسول اور خلیفۂ اسلام قرار دے کر ان کے ہاتھ پر بیعت کرنا بتلا رہا ہے کہ اعلائے کلمۃ اللہ کے لیے قیام خلافت سب سے اہم اور مقدم فرض ہے جو کل عالم کے مسلمانوں پر واجب ہے اسلام نے رہبانیت نہیں سکھلائی ہے۔ سچا مسلمان رات کو اگر مصلی کی پیٹھ پر سوار ہو کر شب بیدار ہوتا ہے تو دن کو گھوڑے کی پشت پر سوار ہو کر وہی شب بیدار شہسوار بھی بنتا ہے سچا مومن رات کو غیبی عالم سے اپنا کنکشن قائم کرتا ہے تو دن کو عالم اسباب

میں مشغول رہ کر تلاش فضل مغفرت کرتا ہے یہ امت تمام امتوں سے اسی وقت بہتر ہو سکتی ہے جب کہ وہ لوگوں کو اچھے کاموں کا حکم دے۔ اور برے کاموں سے روکے۔ ظاہر ہے کہ یہ دونوں فرائض بغیر قوت و قدرت حاصل کیے حاصل ہی نہیں ہو سکتے۔ انہی وجوہ سے مسلمانوں میں اجتماعی زندگی پیدا کرنے کے لیے اور ان کو قوت و قدرت دلانے کے لیے نصب خلیفہ و قیام خلافت مذہبًا ضروری ہے۔ خلافت و امامت اسلام کا ایک اہم ترین فرض ہے۔

مسلم کی حدیث ہے:

من مات ولیس فی عنقہ بیعۃ فقد مات میتۃ الجاھلیۃ	جو شخص اس حالت میں مرا (اگرچہ وہ کیسا ہی بڑا کیوں نہ ہو) کہ اس کی گردن میں بیعت خلیفہ نہیں تو وہ جاہلیت (کفر) کی موت مرا۔

* * *

* * *

ایک حدیث میں ہے:

من لم یعرف امام زمانہ فقد مات میتۃ الجاھلیۃ	جس نے امام وقت کو نہ پہچانا وہ جاہلیت کی موت مرا۔

ایک حدیث میں ہے:

صلوا خمسکم وصوموا شہرکم واطیعوا اذا امرکم	نمازیں پڑھو۔ پانچوں وقت۔ روزہ رکھو چاند دیکھ کر اور اطاعت کرو امیر اسلام کی جب وہ تمہیں کسی بات کا حکم دے۔

* * *

* * *

حدیث میں ہے :

علیکم بالجماعۃ	جماعت کی تابعداری تم سب پر لازم ہے ۔

∴ ∴ ∴

یہ بھی ارشادِ نبوت ہے :

اتبعوا السواد الاعظم الخ	قوم کے سوادِ اعظم کا اتباع کرو ۔
∴ ∴ ∴	جو قوم سے کٹ جاتا ہے وہ آگ
∴ ∴ ∴	میں اپنا ٹھکانہ بناتا ہے ۔

سوادِ اعظم اس اقوامِ امت کو کہتے ہیں جو علماء ربانی صوفیاء سجانی اور امراء حقانی سے بنتا ہے سوادِ اعظم میں علماء روزگار ، امراء فاسق اور پیشہ ور صوفی داخل نہیں ہیں ۔

حق کی طرفداری علمبرداری ہی سے قوم ابھر سکتی ہے

چونکہ حق باطل کی معرکہ آرائی ابتدائے آفرینش عالم ہی سے چلی آرہی ہے ۔ اس لیے اس جنگ میں نفس و شیطان کی رہزنی سے اپنے آپ کو بچانے کے لیے اور اپنے دیگر ابنائے جنس کو بھی محفوظ رکھنے کے لیے انسان کا یہ فطری فریضہ ہے کہ وہ ہمیشہ حق کا طرفدار و علمبردار رہے ۔ مظلوموں اور بیکسیوں کی جائے پناہ بنے ۔ حق کو بلند و بالا رکھنے کی سرفروشانہ جدوجہد کو اپنا مقصد حیات ٹھہرائے ۔ بلاشبہ عقائد و تصورات عبادات و معاملات کو قوت و قدرت اور نظم و استطاعت کے زیور سے آراستہ کرنا جملہ فرمانبردارانِ حق کا ایک

پیدائشی حق ہے ۔ نیز بہ نیت بہی خواہی خلق اپنے کل ابنائے جنس کی مدد کرنا ، ظالم سے مظلوم کا پیچھا چھوڑانا ان کا ایک فطری داعیہ ہے ۔

حدیث میں ہے :

اتق دعوۃ المظلوم ۔	مظلوم کی پکار سے ڈرو ۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ مظلوم کے اور خدا کے درمیان کوئی حجاب نہیں رہتا ۔ حق ہمیشہ مظلوم کی مدد کو بے محابہ نکلتا ہے ۔ حق اجتماعیت کا فروغ چاہتا ہے اور باطل انفرادیت کا ۔ اسی لیے باطل ظالم ہوتا ہے اور حق مظلوم ہوتا ہے ۔

قوت کیونکر پیدا ہو سکتی ہے ؟

اسی لیے اہل حق کا پہلا قدم دعوتِ حق کا مختلف زبانوں کے ذریعہ سے اطراف و اکناف عالم میں ایک مخلص نظام کے ماتحت پھیلانا ہے تاکہ گمراہوں اور مظلوموں کی ہدایت و مدد کا سامان ہو سکے ۔ پھر حلقہ پیروانِ حق سے ان کی جان و مال کا بیعنامہ بحق مالک الملک لوحِ دل پہ لکھوانا ہے ۔ اسی لیے جب تک دعوت حق دلوں میں پوری طرح سے جگہ نہ پکڑ جائے اور اہل حق کا عدد اتنا معتدبہ نہ ہو جائے کہ حق بے یار و مددگار نظر نہ آئے اس وقت تک بسلسلہ دعوت حق ہر قسم کے مصائب و شدائد کو خندہ پیشانی کے ساتھ برداشت کرنا ۔ باطل سے ٹکر نہ لینا ۔ اطاعت امیر اور عدم تشدد کو روح دعوت جان کر ہر اذیت و کلفت کو برداشت کرنا ۔ نظم جماعت کو کمزور کہہ کر اس کے

خلاف آواز نہ اٹھانا ۔ اجتماعی نظام کی اصل اول ہے جو حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی کی زندگی کا آئینہ ہے البتہ جب بسلسلہ دعوت حق و باطل کی چیرہ دستیاں حد سے گزر جائیں اور اس کے جگر سوز مظالم سے اہل حق زچ ہو جائیں تو ان صبر آزما حالات میں ملت اسلامیہ کے اجتماعی نظام کو برقرار رکھنے کے لیے اسلام نے دو صورتیں بتلائیں ہیں ۔ کسی جگہ باطل سے ٹکر لینے کی قدرت نہ رہے اور انصاف سے مایوسی کامل ہو جائے تو وہاں سے ہجرت واجب ہو جاتی ہے جو محض اللہ کے لیے اور اس کے دین کی خدمت کے لیے کی جاتی ہے تاکہ کسی پُرامن خطۂ زمین پر بس کر از سرِ نو اپنی زندگی بنا کر پھر دعوتِ حق کا سلسلہ قائم کیا جائے ۔ اور اگر معاندین حق سے ٹکر لینے کی قدرت ہو تو تیاری جہاد کے بعد جملہ پیروانِ حق کو سیسہ پلائی ہوئی دیوار کی طرح سے یکجان یک قالب ہو کر دنیا کی ہر ایک فانی خواہش سے منہ موڑتے ہوئے اور خوف و طمع سے اپنے کو بلند و بالا رکھتے ہوئے اہل باطل کے مقابلہ پر ڈٹ جائیں ۔

ظالم و مظلوم میں فرق کرنا ضروری ہے

اور اس کے بعد آخری نتیجہ فتح و شکست کو خدا پر چھوڑ دیں لیکن عین معرکۂ کارزار کے وقت بھی عدل و انصاف سے سرِ مو تجاوز نہ کیا جاوے چنانچہ نہ بوڑھوں پر ہاتھ اٹھایا جائے نہ عورتوں اور بچوں ہی کو کوئی تکلیف پہنچائی جائے ۔ خطاوار و بے خطا کے فرق سے کسی آن غفلت نہ برتی جائے بے قصوروں کو امان دینا اور باعزت صلح کر لینا یہ جہاد و قتال کے اس وقت

کے احکام ہیں جب حق تعالیٰ کی خاطر اہل باطل سے جان کی بازیاں لگائی جاتی ہیں ۔

غرض یہ ہے کہ دعوتِ حق کی نشر و اشاعت میں کبھی کسی قسم کا تشدد نہ کیا جائے بلکہ مکارمِ اخلاق کو ہمیشہ ملحوظ خاطر رکھا جائے ۔ ہاں اگر اہل باطل سرے سے دعوت حق ہی کا راستہ روک دیں تو فراہمی قوت پر اللہ کے راستہ سے ایسے روڑے اٹکانے والوں کو ہٹا دینا اس کے منافی بھی نہیں ۔

نظامِ رشد و صلاح اور نظامِ خلافت کا باہمی علاقہ

یہ ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ جب تک نظام دعوت حق باطن کو ہر قسم کے رذائل سے پاک و صاف کرنے میں مشغول رہتا ہے ۔ نظام رشد و صلاح کہلاتا ہے اور جب یہی نظام رشد و صلاح برسر اقتدار آ کر جملہ اختلافات و نزاعات کو حق و انصاف کی سطح پر قائم کر دیتا ہے اور ظاہر کو بھی باطن کی طرح سے پرشوکت بنا دیتا ہے تو نظام خلافت کہلانے لگتا ہے ۔ اسلام انسان کے ظاہر کی بھی اصلاح چاہتا ہے اور اس کے باطن کی بھی اس کا تعلق دونوں سے برابر کا ہے ۔

بیعت کی اہمیت

بیعت ہر دو نظاموں کے لیے ضروری ہے نظامِ رشد و صلاح کی بیعت بیعت تزکیہ و بیعت توبہ کہلاتی ہے جو باطن کو پاک کرتی ہے اور نظامِ خلافت

کی بعیت بیعتِ جہاد کہلاتی ہے جس میں جان و مال کو وقف راہ خدا کر دینے کا عہد کر کے ظاہر کو پاک کیا جاتا ہے۔ معلوم ہوا کہ نظام رشد وصلاح کو نظام خلافت وحکومت الٰہیہ کی صورت میں لے آنا اور کلمۂ حق کو زمین پر اونچا کر دینا ہی انسانیت کی سب سے بڑی کامیابی اور اس کی حقیقی معراج ہے۔

مجاہد و غیر مجاہد برابر نہیں ہو سکتے

قرآن کریم نے مجاہد و غیر مجاہد کے فرق کو یوں ظاہر فرمایا ہے۔

اجعلتم سقایۃ الحاج و	کیا تم لوگوں نے حاجیوں کو پانی پلا
عمارۃ المسجد الحرام	دینا اور مسجد حرام کا آباد کرنا اسی
کمن اٰمن باللّٰہ والیوم.	جیسا ٹھہرا لیا ہے جیسے ایک شخص
الاٰخر وجاھد فی سبیل	مخلص سچے دل سے اللہ پر اور
اللّٰہ لا یستوون عند	اور عالم کے یوم آخر پر ایمان لایا اور
اللّٰہ واللّٰہ لا یھدی	جس نے اللہ کی راہ میں مخلصِ حق بن
القوم الظالمین ہ الذین	کر جہاد کیا اللہ کے یہ دونوں قسم کے
اٰمنوا وھاجروا وجاھدوا	لوگ برابر نہیں ہو سکتے جو حق کے فدائی
فی سبیل اللّٰہ باموالھم	اللہ پر ایمان لائے اور اس کے بعد
وانفسھم اعظم درجۃ	انہوں نے اپنے مالوں سے اور اپنی
عند اللّٰہ واولٰئک ھم	جانوں سے جہاد کیا۔ ایسے مجاہد اللہ

الفائزون ہ	کے یہاں بہت بڑا درجہ رکھتے ہیں
❖ ❖ ❖	اور حقیقۃً اپنی سرفروشانہ انسانی
❖ ❖ ❖	قربانیوں کی وجہ سے یہی لوگ بامراد
❖ ❖ ❖	ہیں۔

اجتماعی نظام کے مراتب و درجات

اس اجتماعی نظام کی ابتداء پہلے اپنے گھر سے ہوتی ہے ہر اسلامی گھر میں ایک مرکزیت مطلوب حق ہے چنانچہ فرمایا ہے

الا کلکم راع وکلکم مسئول	تم میں سے ہر ایک شخص حاکم بھی ہے
عن رعیتہ۔	اور باعتبار اپنے ماتحتوں سے معاملہ
❖ ❖ ❖	کرنے کے اپنے مافوق کے لیے
❖ ❖ ❖	مسئول بھی ہے۔

ہر گھر میں اس کے بڑوں کی توقیر اور اس کے چھوٹوں پر شفقت کو لازم ٹھہرایا ہے اس ابتدائی مرکزیت کے بعد دوسرا اجتماعی نظم اُمراء و غرباء کے درمیان بھائی چارہ کی رسم سے پیدا فرمایا گیا جس کا حاصل یہ ہے کہ جو لوگ محروم الاسباب ہوں انہیں فائزۃ المرام لوگ دامنِ محبت میں چھپا کر بھرپور سرکار کر دیں۔

تیسری جمعیت و مرکزیت ہفتہ واری ہے جو جمعہ سے قائم فرمائی گئی ہے جس میں نہ صرف شہر کے لوگ ہی ایک جگہ اکٹھے ہو کر نصائح دقیقہ و احکاماتِ

اسلامیہ سے واقف ہوتے ہیں بلکہ ایک امام کے فرمانبردار ہوکر ہر شہر کے آس پاس کے لوگ اسی لڑی میں منسلک ہو جاتے ہیں۔ شدہ یہی نظم مذہبی حج بیت اللہ پر آکر کل مسلمانانِ عالم میں قائم ہو جاتا ہے۔ پس نظم و تعارف بین المسلمین مذہبیا ضروری ہے جس کو ہم نے غفلت و بداعمالیوں سے بھلا دیا ہے۔

الحاصل نصب خلیفہ و نصب قوت اہم واجبات میں سے ہے جس کا ترک معصیت ہے۔ سنین ماضیہ میں مسلمانوں نے تحریکِ خلافت میں حصہ لے کر اس مردہ فرض کا زندہ کرنا چاہا تھا اس میں ان کو کامیابی کے آثار بھی نظر آنے لگے تھے مگر بدقسمتی سے دوسری تحریکات میں مصروف ہوکر اپنی اصل تحریک کو بھلا بیٹھے۔ حق یہ ہے کہ خلیفہ کے بغیر تمام انتظاماتِ شرعی اور تمام معاملات یونہی معطل رہتے ہیں۔

خلیفہ جانشینِ پیغمبر ہوتا ہے

خلیفہ ہی فی الحقیقت جانشینِ پیغمبر اور نائب رسول ہوتا ہے جس کی اطاعت کا خدا نے حکم دیا ہے۔ خلیفہ سے سرکشی و بغاوت کی سزا قتل ہے خلیفہ کے تمام احکام واجب العمل ہوتے ہیں بشرطیکہ وہ خلافِ شرع حکم نہ دے۔ کل اہل اسلام و کل علمائے عالم پر خلیفہ کی اطاعت اور اس کے احکام کی تعمیل فرض ہوتی ہے۔

قیامِ خلافت اور اس کے تین طریقے

قیامِ خلافت کے لیے شوریٰ و غلبہ ضروری ہے البتہ نصب خلیفہ کے بعد خلیفہ عادل کی وصیت پر دوسرا خلیفہ کبھی بغیر شوریٰ کے بھی مقرر ہو سکتا ہے بشرطیکہ عامۂ مسلمین کو ایسے انتخاب سے خلاف نہ ہو لیکن خلافت میں یہ طریقہ دائمی طور سے جاری نہیں رہ سکتا۔ معلوم ہوا کہ خلیفے تین طریقوں سے مقرر ہوئے ہیں:-

۱۔ بالوصیتہ

۲۔ بالمشوریٰ

۳۔ بالغلبہ

تسلیم و بعیت خلیفہ ہر مسلمان پر واجب ہے۔ اہل اسلام کے فیصلۂ عام کے بعد پھر اولی الامر سے اس وقت تک خروج و عدول جائز نہیں ہے جب تک وہ حکم اور رسولؐ کے خلاف احکام نہ دے۔

خلیفہ ایک ہی ہو سکتا ہے

خلیفہ کل عالم اسلامی کا ایک ہی ہو سکتا ہے زائد نہیں ہو سکتے البتہ خلیفہ کے نائب متعدد ہو سکتے ہیں جس کی بعیت خلیفہ ہی کی بعیت شمار ہو گی۔ ایک خلیفہ کی موجودگی میں اگر کوئی دوسرا شخص مدعیِ خلافت ہو تو وہ اسلام کا باغی شمار ہوتا ہے جس کی سزا قتل ہے۔

بَیتُ المال

جملہ مہمات و مصارفِ ملی کو بحُسن اسلُوب سرانجام دینے کے لیے اور امت کی اجتماعی زندگی کو قوت و قدرت اور حق و صداقت کی بلند شاہراہوں پر چلانے کے لیے کل مسلمانانِ عالم پر واجب ہے کہ وہ ڈھائی فیصدی سالانہ زکوٰۃ امیر اسلام کو ادا کرکے ایک بیت المال قائم کریں تاکہ امت کے جملہ مستحقین و معذورین کی اجتماعی ضرورتوں کا تکفل ایک نظم کے ماتحت ہو جائے جس طرح نماز بغیر جماعت و امام کے حسن کامل نہیں پاتی۔ اسی طرح سے زکوٰۃ و صدقات بھی بغیر خلیفہ و جماعت خلیفہ کے اپنے حقیقی فوائد سے اہلِ اسلام کو بہرہ ور نہیں کر سکتی اس دورِ عجز میں بھی اگر ہمارے جملہ متعارف اور معتبر ادارے اپنا مالی مرکز ایک ہی بنالیں تو واقعۃً مسلمانوں کا عجزِ قومی بڑی حد تک رفع ہو سکتا ہے۔

اصُولِ خلافت دس ۱۰ ہیں

بہر حال نظامِ خلافت دس عنوانوں پر مشتمل ہے جو یہ ہیں :-

دعوتِ حق - جہاد - قوت و حکمت - قانون عدل - شوریٰ - عمالِ خلافت - فوج - معاہدات - بیت المال - یہ دس عنوان عجزِ قومی کو قوت و قدرت میں تبدیل کرنے والے ہیں۔ جہاں مسلمانوں کی حکومت و غلبہ ہو ایسے حکمران مسلمان پر سعیِ خلافت فرض ہے۔ اگر ایسے مسلمان مل کر خلافت کو قائم

کرنے کی سعی نہ کریں گے تو سب کے سب گنہگار رہیں گے البتہ جس جگہ مسلمان قلیل و مغلوب ہوں وہاں ان کے لیے تحت قوانین مروّجہ اپنی اقتصادی و مذہبی حالت کو درست کر لینا بھی بہت ہے اور ایسے مقامات میں عزتِ مومن اسی میں ہے کہ وہ تعلیم حکمت حاصل کرتے ہوئے محتاج الیہ بن جائیں اور جس درجہ میں بھی قوت و قدرت کی اسٹیج حاصل کر سکیں کریں اگر ایسی جگہ کے مسلمان لہو لعب میں پھنس کر اپنے کو خود عاجز و درماندہ بنائیں گے تو وہ بھی سب کے سب گنہگار ہوں گے۔

ہمیں سوچنا چاہیے کہ ہم کیا تھے اور اب کیا ہو گئے ہیں۔ ہمارے اندر کور باطنی، خبث نفس، فتنہ انگیزی۔ خوشامد۔ خود پسندی جہالت تعصب کس درجہ راسخ ہو چکی ہے۔ آؤ حالی مرحوم کی زبان سے ہم اپنا قومی جائزہ لیں تاکہ پھر جو ہم عرض کریں وہ جزو قلب میں اتر کر رہ جائے۔ ؎

مسدسِ حالی

اگر ایک جواں مرد ہمدرد انساں — کرے قوم پہ دل سے جاں اپنی قرباں
تو خود قوم اس پہ لگائے یہ بہتان — کہ ہے اس کی کوئی غرض اسمیں پنہاں
وگرنہ پڑی کیا کسی کو کسی کی
یہ چالیں سراسر ہیں خود مطلبی کی

نکالے کوئی گر بھلائی کی صورت — تو ڈالیں جہاں تک ہے اسمیں کھنڈت

سنیں کامیابی میں جب اس کی شہرت تو دل سے تراشیں کوئی تازہ تہمت
منہ اپنا ہو گرچہ دین و دنیا میں کالا
نہ ہو ایک بھائی کا پر بول بالا ،

اگر پاتے ہیں دو دلوں میں صفائی تو ہیں ڈالتے ان میں طرح جدائی
ٹھنے دو گروہوں میں جس دم لڑائی تو گویا تمنا ہماری بر آئی ،
بس اس سے نہیں مشغلہ خوب کوئی
تماشا نہیں ایسے مرغوب کوئی ،

تعصب میں بدنیتی میں دغا میں نمود اور بناوٹ فریب اور ریا میں
شقاوت میں بہتان میں افترا میں کسی بزم بیگانہ و آشنا میں
نہ پاؤ گے رسوا و بدنام ہم سے
بڑھے پھر نہ کیوں شان اسلام ہم سے

خوشامد میں ہم کو وہ قدرت ہے حاصل کہ انساں کو ہر طرح کرتے ہیں مائل
کہیں احمقوں کو بناتے ہیں عاقل کہیں ہوشیاروں کو کرتے ہیں گھائل
کسی کو اتارا کسی کو چڑھایا
یونہی سینکڑوں کو اسامی بنایا

شریفوں کی اولاد بے تربیت ہے تباہ ان کی حالت بری انکی گت ہے
کسی کو کبوتر اڑانے کی لت ہے کسی کو بٹیریں لڑانے کی دھت ہے
چرس اور گانجے پہ شیدا ہے کوئی
مدک اور چنڈو کا رسیا ہے کوئی ،

نشے میں مئے عشق کے چور ہیں وہ صفِ فوجِ مژگاں میں محصور ہیں وہ
غمِ چشم و ابرو میں رنجور ہیں وہ بہت ہاتھ سے دل کے مجبور ہیں وہ
کریں کیا کہ ہے عشق طینت میں انکی
حرارت بھری ہے طبیعت میں انکی

اگر ماں ہے دکھیا تو ان کی بلا سے اپاہج ہے باوا تو ان کی بلا سے
جو ہے گھر میں فاقہ تو ان کی بلا سے جو مرتا ہے کنبہ تو ان کی بلا سے
جنہوں نے لگائی ہو لَو دلربا سے
غرض پھر انہیں کیا رہی ماسوا سے

نہیں ملتی روٹی جنہیں پیٹ بھر کے وہ گزران کرتے ہیں سو عیب کر کے
جو ہیں ان میں دو چار آسودہ گھر کے وہ دن رات خواہاں ہیں مرگ پدر کے
نمونے یہ اعیان واشراف کے ہیں
سلف ان کے وہ تھے خلف انکے یہ ہیں

خلف ان کے الحق اگر یاں یہی ہیں　　سلف کے اگر فاتحہ خواں یہی ہیں
اگر یادگار عزیزاں یہی ہیں　　اگر نسل اشراف داعیاں یہی ہیں
تو یاد اس قدر ان کی رہ جائیگی یاں
کہ اک قوم رہتی تھی اس نام کی یاں

رہو گے یونہی فارغ البال کب تک　　نہ بدلو گے یہ چال اور ڈھال کب تک
رہے گی نئی پود پامال کب تک　　نہ چھوڑو گے تم بھیڑیا چال کب تک
گر اسلام کی کچھ حمیت ہے تم کو،
تو جلدی سے اٹھو اور اپنی خبر لو،

تعلیم حکمت

چونکہ اسرار عالم میں دسترس پیدا کرنا زمانہ کے تیور پہچاننا، اپنے بھید چھپانا اور دنیا کے ضروری سلسلوں کے رازوں پر مطلع ہونا اسلامی تعلیم کا ایک اہم جزو ہے۔ چنانچہ حکمت عالم مومن کی ایک گمشدہ پونجی ہے کہ اسے اپنا مال سمجھ کر جہاں سے بھی وہ ملے بلا کسی تعصب اور تکلف کے حاصل کرنا چاہیئے اور ویسے بھی حکمت رسالت کبریٰ کے چار فرائض میں سے ایک اہم فریضہ ہے اس لیے بسلسلہ اجتماعیات مناسب ہے کہ دو چار کلمے اس کے متعلق بھی عرض کر دیئے جائیں۔

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کے فرائض قرآن کریم نے چار ذکر کیے ہیں۔

۱۔ ناواقفانِ حق کے سامنے حسب موقعہ ومحل ان کے ماحول اور ذہن کے مناسب تحت میں آئین فرمانا جس کی وجہ سے ایک منکر حق قبولِ حق پر آمادہ ہو سکے۔

۲۔ جو منصف مزاجِ حق کو قبول لیں ان کے اخلاق کا تزکیہ بذریعہ صحبت ورفاقت کرنا۔ رذائل نفس سے ان کو بچانا ..... اور فضائل و کمالات کا دلوں میں پیدا کرنا۔

۳۔ تصفیہ قلوب کے بعد کتاب اللہ کی تعلیم دینا جس کی بدولت عقلِ نارسا میں رسائی پیدا ہوتی ہے۔

۴۔ تعلیم حکمت کا دینا جس کی بدولت پسماندہ قوم دنیا میں سربلند ہوتی ہے۔

اسلامی تخیل یہ ہے کہ ہر ایک کلمہ گوئے توحید ورسالت کو بعد اقرار توحید ورسالت یہ سمجھتے ہوئے کہ وہ اسلام کا ایک داعی ومنادی ہے۔ انہی چار دل فرائض کو اپناتے ہوئے جلد سے جلد اپنے حلقۂ اثر میں جملہ ناواقفان حق کو حق کا راستہ دکھلانے کے لیے عمل پیرا ہونا چاہیئے۔ اسلام کسی مسلمان کو مسلمان ہو کر جاہل و ناواقف قرآن حکمت دیکھنا پسند نہیں کرتا وہ ہر مسلمان کو داعیِ حق خوش اخلاق معلمِ اسرار غیب وشہادت دیکھنا چاہتا ہے تاکہ مسلمانوں کی زندگی میں حکمت وتقویٰ نمایاں ہو کر غیر متقیوں کے لیے باعثِ تحریص وترغیب ہو۔

اب ہم حکمت کے چند نقوش قدم پیش کرنا چاہتے ہیں تاکہ تاریک مستقبل بن کر سامنے آسکے۔

حکمت و ترقی کی پانچ سیڑھیاں

۱۔ حکمت کی پہلی سیڑھی خدا کی اور بندوں کی ان مشہور زبانوں کا سیکھنا سکھانا ہے جو زیادہ سے زیادہ عالم کے مختلف حصوں میں بولی اور سمجھی جاتی ہوں جیسا کہ حضور نے جنگ بدر کے قیدیوں سے صحابہ کو مختلف زبانیں سکھوائیں۔ اس وقت میں اردو۔ عربی۔ انگریزی۔ ہندی۔ فارسی زبانوں کے سیکھ لینے سے آدمی جس ملک میں بھی چلا جائے اسے عجز نہیں پیش آسکتا عربی زبان بہت آسان زبان ہے بشرطیکہ اس کو پڑھنے کے بجائے لکھ حاصل کیا جائے۔ مثلاً اپنے جسم کے اعضاء کے ناموں کو ابتداءً یاد کیا جائے۔ پھر اپنے گھر کی روزمرہ کی ضروریات سے پھر ماحول کی ہر ایک پیش آنیوالی بات کو سیکھ کر مشق کتابت و مشق گفت گو بڑھائی جائے۔ اگر عربی کا واقعی کوئی ماہر ہو تو عربی بول چال زیادہ سے زیادہ تین مہینہ میں حد سے حد چھ مہینہ میں بآسانی آسکتی ہے۔ عربی زبان سے زیادہ سہل اور جامع زبان کوئی دوسری زبان نہیں۔ مسلمانوں کو قرآن و حدیث سمجھنے کے لیے ویسے بھی اس کی اشد ترضرورت ہے۔

۲۔ حکمت کی دوسری سیڑھی بین الاقوامی تجارت اور اس کے طریقوں کا جاننا ہے یعنی یہ کہ آج کل کیونکر کاروبار کیے جاتے ہیں۔ بنکوں سے لین

دین کی صورتیں ہیں۔

۳۔ حکمت کی تیسری سیڑھی سیر و سیاحت ہے مگر تجارتی نقطہ نظر کے ساتھ ایک ملک کی مفید چیزوں کے نمونے دوسرے ملک میں لے جانا اور دوسرے ملک سے تیسرے ملک میں لے جانا اور اس طرح سے تلاش رزق و فضل کرتے ہوئے اپنے دین کی پاکیزگی و برتری کو مختلف ممالک میں پہنچانا اور مختلف ممالک کی دنیوی ترقیات و صنائع سے اپنی قوم کو خبردار کرنا اسی طرح رفتہ رفتہ اپنی پوری قوم کو تجارت و حرفت میں کامل و اکمل بنا دینا۔

۴۔ چوتھی ترقی کی سیڑھی یہ ہے کہ جس ملک میں بھی جو کلیدی شخص نظر آئے اپنا تعلق ایسے جوہری لوگوں سے پیدا کرنے کی کوشش کرنا اور اپنے معصوم و بے داغ کیریکٹر سے اپنے تعلقات کو دوسروں کی نظر میں باعزت و اعتماد بنا کر اپنے ساتھ قائم کر لینا اور پھر اسی سے انہی ممالک میں انفرادی و اجتماعی زندگی کو اعلیٰ معیار پہ لا کر فائدہ اٹھانا اور ساری قوم کو باعزت بنا دینا۔ نیز ہر ایک سیاح مسلم کا مختلف ممالک میں قائم شدہ حلقہ اثر کو مرکز اسلام کی طرف رجوع کر کے اپنی مرکزیت کو چار چاند لگانا۔

۵۔ پانچواں زینہ ترقی یہ ہے کہ جو تجربات و اثرات کسی فرد امت کو سیاحت و تجارت وغیرہ سے حاصل ہوں ان کو اپنی حیات ہی میں جوہر قابل رکھنے والوں کی طرف منتقل کرنا اور ان کو حق کی وصیت کرتے ہوئے اپنی زندگی میں ہی اپنا وارث فضل و کمال بنا دینا اگر اس سلسلہ میں محض نسل پرستی

کی تنگ نظری سے بالاتر رہ کر جوہر قابل کو تلاش کرنا اور کام کے آدمیوں کو اپنے گرد و پیش میں لینا، خوشامد پرست اور کج خلق لوگوں سے مجتنب رہنا ان کو اپنے کمالات کے لیے دیمک جان کر خوش اسلوبی سے جھٹک دینا اور پاس نہ آنے دینا۔ ہر ملک میں پہنچ کر وہاں کی زبان حاصل کرنے کی سعی کرنا اور ہر ایک زبان کے ذریعہ سے اصُول حق کو پیش کرنا۔

یہ حکمت کے پانچ زینے ہیں جن سے ہمارے اسلاف سرفراز تھے اور ہم بوجہ اپنی کور باطنی و نقص تربیت کے محروم ہیں۔

اب میں اپنے ناظرین رسالہ کے سامنے غالبًا یہ کہہ سکتا ہوں کہ میں نے عقائد کی اٹھائیس منزلیں ان سے طے کرا کر ان کو جامع ترقی کا راستہ دکھلا دیا ہے اور اپنی ضرورتیں مؤخر کر کے ان کے ہاتھوں تک رسالہ پہنچا دیا ہے میں اتنا ہی کر سکتا تھا اس رسالہ سے بجز خدمت خلق کوئی غرض نہیں ہے۔

مقصد اعظم صرف یہ ہے کہ اسلام کے صحیح خد و خال ان کو علمی و عملی زندگی میں نظر آجائیں سو میں اپنی زبان سے یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ میں اپنے مقصد میں کامیاب ہو گیا ہوں۔ ہاں یہ شعر اس موقع پر ضرور پڑھ سکتا ہوں ؎

سودا قمار عشق میں خسرو سے کوہکن ٭ بازی اگرچہ لے نہ سکا سر تو کھو سکا
کس منہ سے اپنے آپکو کہتا ہے عشقباز ٭ او روسیاہ تجھ سے تو یہ بھی نہ ہو سکا

عالم کی پانچ کنُجیاں

آخر میں عالم کی پانچ کنجیاں تبلا کر اب یہ عاجز اپنے ناظرین سے رُخصت ہونا چاہتا ہے۔ عالم کی یہ پانچ کنجیاں جس قوم کے بھی ہاتھ لگ جاتی ہیں وہی عالم میں برسرِ اقتدار آجاتی ہے وہ یہ ہیں:-

کام ۱ دام ۲ نام ۳ سام ۴ بھید ۵

جن کا حاصل یہ ہے۔

اچھے کام کرو۔ اچھا مال پیدا کرو۔ اپنے نام کا سکہ چلاؤ۔ اچھی سمجھ سیکھو اسرارِ غیب و شہادت پہ دسترس پاؤ

حق تعالےٰ ہماری قوم کو یہ پانچ نعمتیں عطا فرمائے آمین۔

اسی پہ یہ رسالہ ختم کرتا ہوں اور ناظرین سے توقع کرتا ہوں کہ اگر وہ اس رسالہ کو اپنے لیے اور اپنی قوم کے لیے مفید سمجھیں تو جو ممکن ذریعہ اعانت جس کے پاس ہو وہ اسے عمل میں لائے۔ کوشش یہ ہونی چاہیئے کہ یہ رسالہ مساجد اور مُعلمان مدارس بچوں کو سمجھا کر پڑھائیں تاکہ نفع دائمی ہو جائے اور میری محنت ٹھکانے لگے۔ آمین۔ ان ارید الا الاصلاح، ما استطعت وما توفیقی الا باللہ علیہ توکلت والیہ انیب ٥

خواستگار دعاء

طاہر بن احمد القاسمی کان اللہ لہٗ

آستانۂ قاسمی دیوبند، ۷ ذی قعدہ ۱۳۷۱ھ

تقریظ مخدوم العلماء حکیم الاسلام حضرت مولانا محمد طیب صاحب

مہتمم دارالعلوم دیوبند

نحمدہٗ ونصلی ۔ رسالہ نافعہ "عقائد الاسلام قاسمی" مؤلفہ برادر عزیز مولوی قاری محمد طاہر صاحب سلمہ اللہ تعالیٰ، احقر نے پڑھا ۔ رسالہ مختلف دینی، علمی، اخلاقی اور تمدنی اصول و فروع کا ایک بہترین مجموعہ ہے جس میں نہایت مفید اور کار آمد معلومات یکجا کردی گئی ہیں ۔ مضامین رسالہ کے ہر ہر کلمہ سے مصنف کی فطری ذہانت و طباعی آشکارا ہے جس میں دانش کے ساتھ دین بھی شامل ہے ۔ بنابریں یہ مجموعہ دین و دانش کا ایک جامع خزانہ ہے ۔ رسالہ میں خطاب بچوں سے کیا گیا ہے مگر باتیں بڑوں کے کام کی تبلائی گئی ہیں جو چھوٹوں کو بڑا بنانے والی ہیں ۔ ساتھ ہی یہ رسالہ نافعہ وقت کی بہت سی اہم ضرورتوں پر بھی حاوی ہے جو نی زمانہ وقت کا تقاضا ہیں ۔ امید ہے کہ اس رسالہ کا مطالعہ بچوں اور بڑوں کے لیے دینی اور دنیوی امور میں رہنما ثابت ہوگا ۔ حق تعالیٰ اس سعی کو قبول فرمائے اور مصنف کو ہم سب کی طرف سے جزاء خیر عطا فرمائے ۔ آمین ۔

محمد طیب غفرلہٗ
مہتمم دارالعلوم دیوبند ۳ رذی الحجہ ۱۳۷۱ھ

تقریظ استاذ الاساتذہ شیخ الادب والفقہ حضرت مولانا محمد اعزاز علی صاحب

نائب ناظم تعلیمات دارالعلوم دیوبند

حامداً ومصلیاً ومسلماً ۔

امابعد ۔ میں نے رسالہ "عقائد الاسلام" مصنفہ نبیرہ حضرت قطب العالم النانوتوی (یعنی مولانا محمد طاہر صاحب زید مجدہٗ) کو دیکھا یہ تصنیف آپکی نئی تصنیف نہیں ہے اس سے پہلے بھی متعدد کتابیں آپکی مصنفہ شائع ہوچکی ہیں اور خدا کا شکر ہے کہ مقبول عام ہوئیں ۔

اس زیر نظر رسالہ کی غرض یہ ہے کہ مسلمان بچوں کو ان کے اصولی و فروعی عقائد اس طرح ذہن نشین کردیئے جائیں کہ اگر بچے ایک طرف ان کو عظیم الشان اور قابل وقعت سمجھیں تو دوسری جانب کسی داخلی یا خارجی اثر سے ان کے اذہان سے محو نہ ہوسکیں ۔

الحمدللہ کہ مصنف ممدوح اپنی اس غرض میں باحسن وجوہ کامیاب ہیں اور اسی لیے میں ان کو اس کامیابی پر جو فی الحقیقت اسلام اور اہل اسلام کی صحیح خدمت ہے، مبارکباد دیتا ہوں اور دعا کرتا ہوں کہ ان کی یہ تصنیف آخری تصنیف نہ ہو بلکہ خداوند عالم ان کو حیات طویلہ عطا فرما کر توفیق مزید عطا فرمائے کہ اسلام کی خدمت کریں ۔

محمد اعزاز علی امروہی
از دیوبند ۲۸ رذی قعدہ ۱۳۷۱ھ چہارشنبہ